دِل کے آنگن میں

گُلابی دُھوپ سی لڑکی

کبھی عشق ہو تو

ایک لمحہ زندگی

مُحبت خوش گُماں ہے

محبت زادِ راہ میری

سُنو یہ موسم وصال ہے

پشیمان

زندگی اے زندگی

سعدیہ عزیز آفریدی

سعدیہ عزیز آفریدی

میرا اور نائمہ کا بس ایک ہی معاملے پر جھگڑا ہوتا ہے وہ ہر چیز کو جیسا ہے ویسا ہے کی بنیاد پر کہنا ضروری سمجھتی ہے مگر میں ہمیشہ مصروفیت میں بہت سی اہم باتیں بھی اگنور کردیتا ہوں دوسری بات میں غصے کا بہت تیز ہوں اگر نائمہ کوئی بات میرے ایک دفعہ کہنے پر نہیں سنتی تو پھر میں اس سے وہ بات منوانے کے لیے سخت لفظ اختیار کرجاتا ہوں۔

بظاہر وہ میرا کام کردیتی ہے مگر اس ——— کا دو تین دن تک پھر کیے دیے والا انداز ہوتا یہ دن بہت بے رنگ ہوتے اور میں اس کے چہرے پر نظر ڈالتا اور خاموشی سے اس کی خفگی کا گراف بناتا رہتا۔ میں قطعی ایک حقیقت پسند انسان تھا مجھے یہ پتا تھا منگائی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس سے کساد بازاری میں بہت اب آئے گا بڑے بڑے ملک دیوالیہ ہونے کے قریب تھے امریکہ جو ساری دنیا پر ورلڈ آرڈر تھوپ رہا تھا خود اس کے پچیس سے تیس بینک بند ہوچکے تھے ڈالر کے مقابلے میں یورو اسٹیبل تھا اور مجھے اپنے وجود کی جنگ ان ہی خیالات میں سوتے اور ان ہی خیالات کے ساتھ جاگتے ہوئے لڑنی تھی اور وہ تھی خوب صورت شاعری کی دیوانی اور میرا خیال تھا دنیا میں اگر کوئی مطمئن ہے تو کم سن بچہ، میری بیوی اور شاعر میری مراد محبت لکھنے والے شاعروں سے ہے اور اسے محبت میں کبھی کبھی مجھ سے زیادہ امجد اسلام امجد۔ یاد رہتا تھا۔

”اگر وہ کل وقتی نہیں جز وقتی آٹے دال کے بھاؤ میں اٹکائے جاتے جیسے میں تو شاید ان سے بڑا انقلابی شاعر کوئی نہ ہوتا۔“

ایک بار زبردستی اس کے نظم سنانے پر میں نے کہا اور وہ تپ کر اٹھ گئی۔

”بس رہنے دیں عملی آدمی بننے کے لیے ضروری نہیں وہ خشک سالی کا شکار بھی ہو شاعری اور رومان کے سوتے تو انسان کے دل کے اندر سے کہیں پھوٹتے ہیں کسی کو سوچنا اور سوچتے رہنا کسی کو دل ہی دل میں چاہتے رہنا یہ کب کہتا ہے کہ آپ دنیا سے منہ موڑ لیں دنیا بھی نبھاتے ہیں لوگ اور دل بھی۔“

”تو تمہیں لگتا ہے میں واقعی اجڈ گنوار ہوں میں نہیں جانتا محبت کیا ہوتی ہے۔“ میں نے کندھوں سے پکڑ کر گرفت سخت کی اس کے چہرے پر نگاہ ٹکائی اور اس کا چہرہ یکدم سرخ ہوگیا تھا۔

”میں نے یہ کب کہا آپ کو محبت نہیں کرنا آتی میں تو بس شاعری کا ذوق پیدا کرنا چاہتی تھی۔“ وہ منمنانے لگی اور مجھے اس کا یہ انداز بہت اچھا لگتا تھا مگر مجھے کبھی اظہار کرنے کی عادت نہیں تھی میں نے گہرا سانس لے کر اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور اسے آہستگی سے چھوڑ دیا اور وہ ابھی بھی نئی نویلی دلہن کی طرح میرے سامنے سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی میرے ہونٹوں کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا جو میں نے جلدی سے چھپالی تھی۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا یہ گھر کے ماحول کا اثر تھا ابا شروع سے ہی چیختے چنگھاڑتے ہوئے ہی ملے تھے میں نے کبھی اماں کے لیے انہیں کوئی تحفہ لاتے یا نرم گفتاری سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا کبھی کبھی ابا آؤٹ آف کنٹرول ہوجاتے تو ہماری پروا کیے بغیر اماں پر ہاتھ بھی چھوڑ دیا کرتے تھے سو میری نظر میں شادی شدہ زندگی تو بس یہی سپاس نامہ بنی ہوئی تھی ہاں یہ تھا کہ میں نے کچھ اصول بنالیا تھا کہ نہ بہت نرمی نہ بہت سختی اور بچوں کے سامنے تو بالکل ہاتھ نہیں اٹھانا، کبھی بھی نائمہ کی کسی تلخ کلامی سے ہاتھ میں کھجلی ہوتی بھی تو میں خود سے کہتا۔

”گنوار اور پڑھے لکھے انسان میں کوئی فرق اگر ہے تو وہ سوچ کا ہی ہوسکتا ہے جو لوگ پڑھ لکھ کر بھی اجڈ گنواروں والا رویہ رکھتے ہیں مجھے ان پر ہر انسان سے زیادہ ترس آتا ہے کیونکہ وہ خود نہیں جانتے وہ کیا پاسکتے تھے اور کیا آسانی سے کھو رہے ہیں۔“

”کیا سوچ رہے ہیں....“ یکدم نائمہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”کچھ نہیں میں نے آپ کو آف وائٹ سوٹ استری کرنے کو کہا تھا مگر آپ نے یہ اسکائی بلو استری کر دیا۔“

”تو پہن لیں نا یہی آپ کو کون سا برد کھوے میں جانا ہے۔“ وہ جان چرا رہی تھی اس سے سارے کام کروانا آسان تھا بس استری کروانا بہت مشکل تھا گھر میں تو وہ خود بغیر استری کے ہی کپڑے پہنتی تھی۔ کبھی پوچھا بھی کہ اس میں کیا الجھن ہے تو یہی کہتی۔

”شروع سے عادت نہیں ہے گھر میں بھی بہنوں سے کروائی تھی جب بہنیں بڑی ہوگئیں تو بار گیننگ کرکے رشوت دے دلا کر کپڑے استری کروائے، شکر کریں آپ کو استری کرکے دے دیتی ہوں۔“ پتا نہیں اسے کس بات کا زعم تھا؟ وہ مجھ سے خاموشی تو اختیار کرتی تھی مگر اسے یہ یقین تھا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔

”کیوں یقین ہے تمہیں....“ ایک بار میں نے پوچھا اور وہ چپ کی چپ رہ گئی پھر بہت آہستگی سے بولی۔

”پتا نہیں بس مجھے لگتا ہے آپ میرے بغیر کہیں خوش نہیں رہ سکتے۔“ تب میں نے ہنس کر کہا تھا۔

”میری صلاحیتوں پر شک نہ کریں بیوی صاحبہ میں کہیں بھی کسی کے ساتھ بھی خوش رہ سکتا ہوں۔“ اور

سنائی نہیں دی تھی۔

"اچھا میں کر دیتی ہوں استری ..." اس نے سوچ میں مستغرق دیکھا تو میری ناراضی سمجھ کر فوراً" کھڑی ہو گئی میں نے بھی بوزیکی دیاوہ آدھے گھنٹے میں استری کر کے لوٹی تھی میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا یکدم میں نے دیکھا وہ بہت آہستگی سے میرے جوتوں کے تسمے کھول رہی تھی۔

"ارے پاگل ہو گئی ہو۔" میں نے پیر پیچھے کیے مگر اس نے جوتے اتار کر ہی دم لیا تھا اس لمحے وہ مجھے دنیا کی سب سے پیاری جیون ساتھی لگی تھی وہ جو کہتی تھی آپ میرے بغیر کہیں خوش نہیں رہ سکتے تو ... اس کا یہی یقین تو تھا میں کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا واپس لوٹا تو وہ شام کی چائے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلتا ہے مجھے کب کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے۔"

"بس پتا چل جاتا ہے نا۔" وہ چائے رکھ کر جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹھو نا میرے ساتھ آج کوئی نظم نہیں سناؤ گی۔" حالانکہ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا دفتر میں فون اٹینڈ کرتے کرتے لوگوں سے مارا ماری کر کے اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش کرتے میں اندر سے بالکل تھکن سے چور تھا اور وہ میری اس خیر سگالی پر فوراً" ڈائری اٹھا لائی تھی۔

"ہائے سعدان مصطفیٰ بیوی ہو تو بس اسے شاعری کا شوق نہ ہو۔" میں نے چائے کے ساتھ دعا بھی کی مگر وہ لمحہ قبولیت نہیں تھا اور وہ سنانے لگی۔

محبت خود بتاتی ہے کہاں کس کا ٹھکانہ ہے
کسے آنکھوں میں رکھنا ہے کسے دل میں بسانا ہے
رہا کرنا ہے کس کو زنجیر کرنا ہے
مٹانا ہے کسے دل سے ' کسے تحریر کرنا ہے

میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے پھر سے اونگھ گیا تھا اور جب ساڑھے آٹھ بجے اٹھا تو وہ کچن میں مصروف تھی اب میں چاہتا بھی تو اس کے شعروں پر داد نہیں دے سکتا تھا ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

"کیا پکا رہی ہو۔" میں نے ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔

"قیمہ پیاز ..."

"ہی ..." میں نے بات کرنے کے لیے لفظ جوڑے اور وہ یکدم مڑ کر بولی۔

"آپ جب تک ٹی وی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھیں میں پندرہ منٹ میں روٹی ڈال کر کھانا لاتی ہوں۔"

میں دونوں بچوں کی ہاؤ ہو کے ساتھ معانقہ کرتا ٹی وی دیکھنے لگا پھر وہ ٹیبل پر کھانا سجانے لگی مجھے سلاد کا بہت شوق تھا کوئی بھی سالن ہوتا روز کی روٹین تھی وہ سلاد ضرور بناتی تھی اور مجھے اس کی یہ عادت بہت بھلی لگتی تھی جو بات ایک بار کہہ دو دوسری بار اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

بچے 'گھر' نوکری 'بیوی سب ایک ساتھ چل رہے تھے کہ اچانک معمولی سی بات پر میں اس سے لڑ پڑا۔

ہوا یہ کہ میں بیٹے کی سائیڈ لیتا تھا ہمیشہ اور رات کو بھی اچانک ہی یہی معرکہ ہو گیا بیٹا اسکول میں ٹیچر سے بدتمیزی کر کے آیا تھا اور میں اسے کہہ رہا تھا کہ "آج کل ٹیچر بہت زیادہ فیور لے رہے ہیں میڈیا نے ان کی پولیس کھولنی شروع کر دی ہیں کتنے کیس تم نے دیکھے ہیں وہ بچوں پر کتنی زیادتی کرتے ہیں اگر بات غلط ہے تو احتجاج کرنا ضروری ہے اور اگر نعمان نے کچھ پلٹ کر کہہ دیا ہے تو یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ تم اس کو دوپہر سے کھانے کو ترسا رہی ہو۔"

"نعمان چھوٹا نہیں ہے 8th میں پڑھتا ہے اسے پتا ہونا چاہیے چھوٹے بڑے کی کیا تمیز ہوتی ہے اور استاد کا کیا رتبہ ہوتا ہے اور آپ اس کی بے جا حمایت ہی کر رہے ہیں یہ علم دینے محبت سکھانے 'دنیا کے اصول تجویز کرنے والے لوگ اتنے کم حیثیت نہیں ہوتے سعدان! بھلے معاشرے میں یہ باقی سب دوسرے شعبوں میں کام کرنے والوں سے معاشی طور پر کم درجے پر ہوں مگر میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں اور چاہتی ہوں میری اولاد بھی ان کی عزت کرے۔"

اور بس یہی معاملہ گھر میں ایک ہنگامہ کر گیا تھا وہ ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئی تھی اور مجھے اکیلا پن محسوس ہونے لگا تھا نعمان میری شے پر اکڑ کر چلنے لگا تھا اب وہ جب دل چاہتا اپنے استادوں کے ساتھ بدتمیزی کرنے لگتا تھا میرا چھوٹا بیٹا روز اس کی شکایتیں اپنی ماں سے کرتا اور میں اڑتے اڑتے سنتا رہتا۔

نائمہ ایک ہر شکایت کے بعد مجھ پر تپتی ہوئی نظر ڈالتی اور اپنے کسی کام میں اپنا غصہ نکالنے لگتی مجھ سے اب اس کی چھوٹی موٹی جھڑپیں رہنے لگی تھیں عموماً" وہ نارمل ہی بات کرتی مگر میں اس کی سرد مہری کو لے کر اس کی ہر بات پر چڑنے لگا تھا جب میں غصہ کرتا تو وہ چپ کی چپ رہ جاتی کچھ کہنے کی کوشش کرتی اور پھر ہونٹ سی لیتی پھر یہ دو ماہ کی بعد کی بات ہے جب اچانک نعمان کو میں نے اپنے دوست کی پارٹی میں جانے سے منع کیا۔

یہ کوئی دو بجے تک چلنے والی پارٹی تھی اور میں بچوں کو اس عمر میں اتنی رات گئے باہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھا بقول اماں کے یہ عمر سنورنے کی جتنی نہیں ہوتی بگڑنے کی اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے بچہ اس عمر میں جاذب ہوتا ہے ہر اچھائی برائی فوراً" جذب کرتا ہے اور بس یہی سوچ کر میں نے اسے منع کیا پہلے تو وہ مان بھرم دکھانے لگا پھر یکدم وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"پاپا آپ یہ ٹپیکل اجڈ گنوار والدین کی طرح کی بات نہ کریں۔" میں کھڑے سے یکدم بیٹھ گیا تھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"آپ کو پتا ہے مسٹر رفیقی پر اتنی بدتمیزی کا کیا ردعمل ہوا ہو گا۔ وہ استاد ہیں ہم اگر بچوں کو گھر میں تمیز اور رشتوں کی قدر نہیں سکھائیں گے تو کسی بچے کو کتنا محروم کر سکتے ہیں استاد۔" میرے کانوں میں اپنی بیوی کی آواز گونجی تھی میں نے اس وقت اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی تھی مگر آج۔

میں نے پہلی بار نعمان پر ہاتھ اٹھایا تھا نعمان کا چہرہ اب میری طرح سکتے کی کیفیت میں تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنے بدتمیز ہو چکے ہو۔ آج کے بعد میں یہ لہجہ کبھی نہ سنوں نہ اپنے سامنے نہ تمہارے استاد کے سامنے 'رشتوں کی اور بڑوں کی عزت کرنا سیکھو' دوبارہ مجھے تمہاری کوئی شکایت نہ ملے۔"

نعمان پیر پٹختا ہوا اندر چلا گیا وہ جس مزاج کا ہو گیا تھا اسے ایک دم سے سدھارا نہیں جا سکتا تھا مگر خیر تھی ابھی میں نے اتنی دیر نہ کی تھی میں نے اس کے جانے کے بعد سر جھکا لیا تھا مجھے خود پر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنی زبان کی تیزی اس پر ضائع کی جو مجھ سے بھی زیادہ میری خیر خواہ تھی۔

میں آہستہ قدمی سے چلتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور مخمور لہجے میں کہا۔

نہ میں حسین نہ وہ خوب صورت مگر پھر بھی
جو ہمیں ایک ساتھ دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے

اس نے حیرت سے پلٹ کر مجھے دیکھا اس کی آنکھ میں وہی محبت اور حیا ایک ساتھ در آئی تھی اب میں نے اس کے کندھوں کو تھام کر اسے اپنے سامنے کیا اس دوران میں کچن کا دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

"کیا ہے بچے کیا سوچیں گے۔"

"کچھ نہیں سوچیں گے تم میری بیوی ہو یار کوئی گرل فرینڈ تھوڑی ہو۔"

میں نے اس کے چہرے کو دیکھا اور کبھی کا پڑھا ہوا شعر گنگنانے لگا۔

چلو جذبہ دل آزما کے دیکھتے ہیں
خواب اس کی آنکھوں میں سجا کے دیکھتے ہیں
نہ جانے کیوں وہ ہمیں اپنا اپنا سا لگتا ہے
دل کے آنگن میں جب اسے سجا کے دیکھتے ہیں

میں نے معمولی سی گستاخی کی تھی وہ یکدم بھڑک کر گئی تھی اور میں ہنستا ہوا باہر چھوٹے بیٹے کے ساتھ ٹی وی دیکھنے لگا مجھے پتا تھا نعمان کو راک میوزک پسند ہے سو میں نے ٹی وی کا والیم بڑھا دیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ میرے دوسرے پہلو میں بیٹھا تھا۔

"سوری پاپا ..." بہت مدھم سی آواز میرے قریب بکھری اور میں نے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔

☼ ☼

"تمہیں معلوم ہے، پہلی بار تم صبح کس مبارک دن اٹھے تھے؟" ایاز نے اس پر سے لحاف اتارا اور وہ کسمسا گیا۔

"چھوڑ سردی بڑی ہے میری جان! ایسا مذاق نہ کر۔ تجھے پتا ہے نا پھر میرا غصہ..." وہ کپکپا کر بولا اور ایاز ضیاء کو ہنسی آ گئی۔

"حالت دیکھی ہے؟ ایک ساتھ لفظ نہیں بولے جا رہے اور غصہ دکھانے کی بات کرتا ہے چل اٹھ نا!" اس نے لحاف پھر کھینچا تھا۔

"ایاز کے بچے! نہ ستا ملنگا نوں... سونے دے میری جان!" وہ منت پر اتر آیا۔

"تجھے میں نے ایک ہفتے پہلے کہا تھا۔ ہم نے یہ شوٹ کرنا ہے، دس بج رہے ہیں اور تو ایسے بول رہا ہے جیسے میں تجھے چھ بجے اٹھانے آیا ہوں۔" ایاز ضیاء نے خفگی سے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا یہ اس کی ناراضی کا کھلا اظہار تھا۔

دو سیکنڈ گزرے تھے خاموشی کو، اس نے لحاف سے سر نکالا تھا۔

"کیا ناراض ہو گیا ہے اے زی (ایزی)؟"

کوئی جواب نہ آیا تو وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ایزی کے بچے! زیادہ نخرے مت دکھایا کر۔"

"میں نے کچھ کہا ہے کیا... لیٹے رہو بس، نقصان کا کیا ہے، تیرے موڈ سے زیادہ تھوڑی ہے۔" وہ اب اٹھ کر فلیٹ کے کچن میں جا کر کافی بنا رہا تھا۔

وہ ہلکے سے مسکرایا۔ جانتا جو تھا کہ جذباتی دھمکی دی جا رہی ہے۔ آہستگی سے بہ وقت پیر نکالے۔ اس نے مڑ کے دیکھا، مگر ایک تیز سی نظر سے اور واپس بے پروا بنا کافی پھینٹتا رہا۔

اب اس نے فریج سے اس کے لیے بریڈ پیس نکال کر سینڈوچ تیار کرنا شروع کر دیے تھے۔

وہ ہینگ شدہ کپڑے اٹھا کر واش روم جا چکا تھا۔ اس لیے اس نے مطمئن ہو کر اس کی بکھری چیزیں سمیٹنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اور حمزہ ولی شروع سے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ایاز ضیاء ایک مکمل فیملی کا حامل ایک نارمل انسان تھا جس کی زندگی میں ہر رشتہ اس کے وجود کو باندھ کر رکھتا تھا، محبت سے سمیٹ لیتا تھا اور حمزہ ولی وہ ایک ذرا دکھری ٹائپ انسان تھا، جس نے اپنے باپ کی پہلی کرپشن کی چوری پکڑتے ہی اس کے دفتر سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ایک معمولی سے آفس میں غیر معمولی نوکری کرنے لگا تھا۔ یہ صرف اس کا ذاتی خیال تھا، ورنہ ریکارڈ کیپنگ کا کام کوئی اتنا غیر معمولی کام نہیں تھا، لیکن چونکہ وہ مزاج کا الگ تھا، سو ایک ریٹائرڈ کرنل صاحب کی طویل و عریض لائبریری میں کتابوں کی دیکھ بھال اور ان کتابوں کا ریکارڈ رکھنے کی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔

حمزہ ولی کی فیملی میں صرف اس کے بابا تھے اور ماما نہ ہونے جیسی تھیں۔ انہیں نہ اس کی آمد کی خوشی تھی نہ غائب ہونے کا دکھ، سو وہ اسی دکھ کی گولڈن جوبلی مناتے ہوئے اب الگ فلیٹ میں رہتا تھا۔ یہ فلیٹ اس کے ایک تیسرے دوست کا تھا، جو زیادہ تر یوکے میں ہوتا تھا اور سال میں کبھی کبھار ہی چکر لگاتا تھا۔ اس لیے حمزہ ولی اس فلیٹ کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ بظاہر پورے گھر کی چابیاں اس کے پاس رہتی تھیں مگر وہ پھر بھی ایک صوفہ کم بیڈ پر ہی گزارا کرتا تھا۔

گھر کا کھانا تب ہی میسر آتا، جب ایاز ضیاء اس کے گھر آتا، ورنہ ہوٹل بازی ہی چلتی تھی۔ وہ بالوں کو تولیے سے خشک کر کے آیا تھا اور اسے گرما گرم کافی اور سینڈوچز ٹیبل پر سجے ملے تھے۔

"کتنا خیال کرتا ہے نا تو میرا؟"

"ٹیں ایویں، دل تو نہیں چاہتا۔ مگر تیری شکل ذرا مسکین ہے۔"

"شکل نہیں سہی۔ لفظ شی کل ہے اور میری شی کل تو معصوم بھی بڑی ہے۔" وہ لمبے لمبے ہاتھ مار رہا تھا اور ایاز ضیاء نے اس کے گرد شال لپیٹ دی تھی۔

"پتا نہیں۔ تجھے اتنی سردی کیوں لگتی ہے۔" اس نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا اور ہیٹر آن کر دیا۔

"تو، تو ولی بننے والا ہے، دل کے حال جاننے لگا ہے۔" وہ ہیٹر کی گرمائش سے بہتر محسوس کر کے پٹاخ سے بولا اور ایاز ضیاء مسکرانے لگا۔

"میرا اگر کوئی بھائی ہوتا نا تو بالکل تیرے جیسا نکما ہوتا۔" اس کے لہجے میں لاڈ جھلک رہا تھا۔ حمزہ ولی نے چونک کر اسے دیکھا۔ تین بھائیوں کے ہوتے ہوئے وہ

کی انگیجمنٹ کر رہا تھا۔
"کیا ہوا فیضی بھیا نے پھر کوئی پرابلم کر دی؟" اس نے برتن سمیٹنے شروع کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
"بھول گیا ہماری دوستی کی جپھی۔" کافی کا آدھا کپ وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ایاز ضیاء کے ہونٹ پہلی بار مسکرائے اور وہ مسکراتے ہوئے بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔
"کبھی کبھی جو لوگ مسکراتے ہیں وہ آسمان پر کھلنے والی قوس قزح کی طرح لگتے ہیں، ایک دم بنداس اور مست۔" ایاز ضیاء نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹی۔
"علمی ادبی دائرے میں رہ کر بھی تو کتنی بے ادب زبان بولتا ہے پوری لنگوٹیا بچے۔"
"تو نوکری پیسوں کے لیے کرتا ہوں، سارے بھاری بھرکم لفظ کندھوں پر اٹھائے پھرنے کے لیے تھوڑی کرتا ہوں۔" وہ اب ٹائی کی ناٹ باندھ رہا تھا۔
"آخر یہ بتا مجھے تیرے ساتھ جا کر کیا ملے گا؟" اب وہ پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ تب ہی وہ اس کی پشت پر کھڑے ہو کر بولا۔
"پتا نہیں تجھے میرا وجود ایسا ضروری لگتا ہے یا نہیں، لیکن مجھے تیرے ہونے سے بڑی ڈھارس ملتی ہے، یہ میرا پہلا پروجیکٹ ہے ذاتی اور اکیلا اس لیے تو میرے ساتھ ہو گا تو مجھے اچھا لگے گا۔" وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھنے لگا پھر پلٹ کر بولا۔ "چل جا تیری محبت پر تو میں تیرے لیے جان دے دوں پھر یہ سردی یہ تو ماٹھی سی چیز ہے۔"
"بہت زیادہ ڈائیلاگ نہیں ہو گیا۔" ایاز ضیاء نے جوس کی بوتل فریج سے نکالی تھی اور ایک بیگ کندھے پر ڈالا تھا اور حمزہ ولی نے شرارت سے کہا۔
"ایک ڈائریکٹر پلس اسٹوری رائٹر کے ساتھ چل رہا تھا تو سوچا دل پشوری کے لیے کوئی جملہ میں بھی سنا دوں بھائی کو۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا، پھر آہستگی سے بولا۔
"یہ بیگ میں کیا ہے خودکش بمبار؟" ایاز ضیاء نے

کس کر چیخ مارا اور دھیرے سے کہا۔
"تیرے کھا مرنے کے لیے پی جی سے سینڈوچز اور کچھ اسنیک اور کافی کا تھرماس ارینج کروایا ہے۔ بھوک جو لگتی ہے تجھے بڑی۔"
"او جیو پی جی! کاش یہ مزے میں ہمیشہ کی بنیادوں پر حاصل کر سکتا۔" وہ خوش ہوتے ہوتے اداس ہو گیا، مگر زیادہ دیر تک نہیں رہا، پھر کار میں بیٹھا تو آہستگی سے پوچھنے لگا۔
"میرے کھانے کے اسٹاک کے ساتھ اسٹوری رکھ لی ہے کیا؟"
"رکھ لی ہے بہت بڑا سنگر ہے یار! مجھے تھوڑا سا ڈر لگ رہا ہے، عموماً یہ سارے کام فیضی بھیا، ارباز بھیا ہی کرتے ہیں، سو مجھے لگتا ہے نہ کر پایا تو میری تو عزت ہو جائے گی پاپا کے سامنے۔"
"نہیں ہو گی عزت میں ہوں نا!" وہ خاص اسٹائل سے بولا اور ایاز ضیاء ہنس پڑا۔
"کیا بات ہے میرے شاہ رخ خان۔" وہ آداب بجا لایا، پھر شوٹ پر پہنچے تو وہ مصروف ہو گیا اور وہ شال لپیٹے ایک صوفے پر بیٹھا نیند سے جھولتا رہا، یہاں تک کے ابھی صرف ایک منٹ کی ریکارڈنگ ہوئی تھی اور چائے کا دور چلا تھا، تب ہی اس نے اس شوٹ کی ماڈل کو اپنے قریب بیگ میں گھسے ہوئے اور بری طریقے سے تنگ پایا تھا۔
"آپ اپنے بیگ میں کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟"
ماڈل گرل نے گھور کے دیکھا اور تپ کر جواب آیا۔
"اونٹ، میرے ریوڑ کا اونٹ گم ہو گیا ہے، آپ نے دیکھا ہے کیا؟" اس نے دلچسپی سے دیکھا اور اس کے پیچ تھری پر چھپنے والے لو اسکینڈل کا لطف لیتے ہوئے بولا۔
"خیر میم! مسٹر رفیق الزماں اب اتنے بھی برے نہیں کہ آپ انہیں۔" وہ آدھا جملہ کہہ کر آدھا جملہ سمجھا کر مسکرانے لگا، ماڈل گرل نے اسے گھورا تھا۔
"آپ سخت بدتمیز انسان ہیں۔"
"شاید لیکن ایک اچھائی ہے کہ جھوٹ نہیں

بولتا۔" اس کے لہجے میں خاص طرح کی کاٹ تھی۔ جیسے یہ ایک خاص طرح کی رنجش تھی، جو کسی بھی ایک جیسے حالات و واقعات میں ابھر کر سامنے آگئی تھی۔
"مجھے آپ کا چہرہ بہت دیکھا ہوا لگتا ہے۔"
"جی میں حمزہ ولی ہوں، ولی حمدان کا بیٹا، کافی دنوں ان کی ایک جذباتی ٹھرک چلتی رہی ہے پی یا جی کے ساتھ۔"
"آپ کیسے بیٹے ہیں اپنے باپ کو ذلیل کر رہے ہیں؟"
"نہیں میں نہیں ان کے اپنے کرتوت ایسا کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے میری شکل میرے پاپا کی کاربن کاپی ہے۔ اور ایک سیکنڈ بعد سہی لیکن آپ کو ضرور یاد آجاتا یہ اسکینڈل۔۔۔ اور پھر آپ میرے پیٹھ پیچھے ان کی میری برائی کرتیں، بخیے ادھیڑتیں تو بہتر نہیں میں نے خوشی سے آپ کو یہ موقع خود دیا۔"
"آپ عجیب انسان ہیں۔"
"جی! آپ میرا والٹ دیکھ لیں تو آپ کو میں غریب بھی لگنے لگوں گا، دیکھیے میرے پاس جو کچھ ہے اپنا کمایا ہوا کچھ نہیں، میرا نام میرے باپ کا احسان ہے، میری تعلیم میری ماں کی کٹی پارٹی کی سہولت سے کیے جانے کی وجہ سے اتنی اعلا پائے کی ہے بورڈنگز میں پڑھا ہے کوئی نیکی نہیں ہے میرے نامہ اعمال میں صرف اللہ کی مغفرت کی امید کے سوا۔"
"آپ انسان ہیں یا ولی ہیں۔"
"میں ایک واہمہ ہوں میم! بس کوشش کر رہا ہوں کہ وجود کی صورت میں اپنا آپ منوا سکوں۔"
"آپ کچھ بتائیں گی اپنے بارے میں؟"
"میں کیا بتا سکتی ہوں، بس ایک ماڈل گرل ہوں کسی مجبوری کا معاملہ نہیں، بس لائم لائٹ میں آنے کا شوق اس راستے پر لایا ہے، میرے پاس بھی کوئی اچھی اور بڑی نیکی نہیں ہے۔ سوائے اللہ کی مغفرت کی امید کے سوا۔" حمزہ ولی نے اپنی توجہ اس کی طرف لگا دی اور اسے پہلی بار لگا وہ جتنی نخریلی اور ظاہری چمک دمک پر

مرتی ہے، وہیں وہ چھوٹے چھوٹے احسان بھی کر دیا کرتی تھی، شوٹ پر کھانا اتنا سارا منگوایا تھا، اس نے کہ ایاز ضیاء تڑپ اٹھا تھا۔
"یہ اس کی فیگر دیکھ اور اس کا آرڈر دیکھ جیسے کسی ٹبر کو کھلائے گی۔"
"ابھی دیکھ وہ کیا کرتی ہے۔" اس نے دیکھا، اس نے واقعی بہت کم کھایا تھا اور باقی کا سارا کھانا کریو کے حصے میں آگیا تھا۔
"یہ لڑکی خود کو کیا سمجھتی ہے، کوئی رابن ہڈ یا ولیہ۔"
"رہنے دے ولیہ؟ مجھے پتا ہے ان لوگوں کا لائف اسٹائل کیا ہے، یہ بھی شوشا ہی ہے ساری۔" وہ کریو کے ایک بندے کو ڈانٹ رہی تھی۔
"دیکھ اب دیکھ اس کی نرمی کی ساری قلعی کھل گئی نا، کتنے بے ڈھنگے طریقے سے ڈانٹ رہی ہے۔" حمزہ ولی دلچسپی سے اس کی طرف بڑھا، وہ سگریٹ کو شعلہ دکھا کر بڑبڑا رہی تھی۔
"پاگل ذلیل کرتا ہے مجھے، کہہ رہا ہے میں نے اسے کھانا کھلایا۔ میں کون ہوتی ہوں کھانا کھلانے والی۔ اللہ نے جس کو جس طرح دینا تھا دیا اور وہ دے گا۔ میں کون ہوتی ہوں۔" وہ بڑبڑا رہی تھی اور اسی وقت ایاز ضیاء نے آہستگی سے نماز کے لیے تھوڑی دیر کے لیے وقفہ لیا تھا۔ ایاز ضیاء اور کریو کے دوسرے لوگ جنہوں نے نماز پڑھنی تھی وہ ماربل کے فرش پر نماز کے لیے ایک ساتھ کھڑے ہو کر اللہ کے سامنے سربسجود تھے۔
وہ لڑکی ایک صوفے پر بیٹھی گیم کھیل رہی تھی۔
اور حمزہ ولی اسے ٹکٹکی کر رہا تھا۔
"آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟"
"بس کیا کروں۔ ہوتا ہی نہیں۔"
"اب ایسے تو نہ بولیں، ہر انسان کے لیے نماز ضروری ہوتی ہے۔"
"تم کیوں نہیں پڑھتی ہو نماز؟" اس نے سوال کیا اور اس نے سر جھکا کر کہا۔
"نماز پڑھنا ہر ایک کو نہیں ملتا۔ میری ماں کہتی ہے

جس سے اللہ محبت کرتا ہے' جسے چاہتا ہے کہ وہ اس کے آگے ہاتھ پھیلائے' جس کا دل پسند آتا ہے وہیں وہ قیام کرتا ہے' اس کو جھکنے کی توفیق دیتا ہے۔"

"آپ تو کافی ذہین ہیں۔" وہ واقعی ستائش کرنے پر آمادہ تھا اور اسے لگا' سنا نہیں اور وہ پھر سے بولی۔

"میری ماں کہتی تھی جتنے لوگ جھکتے ہیں ان میں سے بھی بہت کم اللہ کے قریب جا پاتے ہیں۔ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں' پر اللہ کے بندوں سے محبت نہیں کرتے' ہم نیکی کو بڑے بڑے لفظوں سے جتاتے ہیں' مگر ہم کسی کی آنکھ کے آنسو نہیں صاف کرتے۔ عبادت مجھے نہیں کرنی آتی' مجھے اپنے اعمال سے' اللہ سے ڈر لگتا ہے' مگر میرا دل کہتا ہے وہ بڑے سے بڑا گناہ معاف کر سکتا ہے اور بس میرے لیے اللہ یہ ہی ہے۔"

ایاز ضیاء نماز پڑھ کر کافی کے کپ لے کر باہر گارڈن میں بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

اور ضیاء کا ایک خاص نماز دوست ان تینوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

"تجھے کیا مل رہا ہے اس پاگل لڑکی کی باتوں میں' ایک نمبر کی ٹھرکی ہے ڈر نمبر ہے کیا کام ہے' جو نہیں کرتی اور تو ہے اس کی باتوں کو اتنے خشوع و خضوع سے سن رہا تھا' جیسے وہ تجھے تبلیغ کر رہی تھی۔"

"آپ تبلیغ کسے کہتے ہو؟"

"کوئی ایسی بات جو دل کو لگے' جو بڑے بڑے اسکالر بولیں ان کی باتوں میں ان کا تجربہ بولتا ہے' لفظ چپ رہیں تب بھی دل سن لیتا ہے۔"

"وہ کہتی ہے مسلمان وہ ہے' جو ایک دوسرے مسلمان کا عیب دیکھے تو اسے چھپالے' جو میاں' بیوی کے درمیان چھوٹی بات کہہ کر صلاح کروا دے' آپ کو تو پتا ہے وہ ابھی کچھ دیر پہلے اپنی دوسری ماڈل لڑکی کے شوہر سے اس کی بیوی کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ اسے کتنا اہم اور ضروری سمجھتی ہے' اپنی زندگی کے لیے اس کے جھوٹ سے ایک گھر ٹوٹنے سے بچ گیا اور اس نے اپنی کسی اور دوست کی بلا کو ابھی میرے سامنے اپنے گلے کا ہار بنایا ہے۔"

"احمق ہے' اسے بکواس بازی کے لیے ایک لڑکی چاہیے اور وہ میں ہوں' میری دوست کی شادی ہونے والی ہے نا وہ اب یہ رشتہ جوڑنا افورڈ نہیں کر سکتی۔" اس نے اس کے الفاظ دہرائے اور حسب توقع مسٹر باری نے چڑ کے کہا۔ "بس رہنے دے اسے مجھے پتا ہے اس کے جھوٹ' سچ تو ہی متاثر ہوا کر۔"

ایاز ضیاء نے آنکھ کے اشارے سے اسے چپ کروایا تھا۔

"آپ میں نے سنا ہے تہجد گزاری کرتے ہیں؟" ایاز ضیاء کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا مگر وہ مسکرا کر بولا۔

"جب رات کے پہر آپ اللہ سے مانگتے ہیں تو کبھی میرے لیے بھی کچھ مانگا؟ دیکھیے' میں ایک نمبر کا لیزی ہوں' فجر کی نماز کے لیے بھی نہیں اٹھ پاتا' اس لیے کیا ہی اچھا ہو اگر آپ مجھے بھی یاد رکھیں باری بھائی!" وہ بات کو گھما کر بہت اچھے سے موڈ میں لے آیا تھا۔

باری رضا۔ اس پروجیکٹ کے سیکنڈ چیف تھے اور ارباز بھائی کے بہت سے دوستوں میں سے تھے۔ اس لیے ایاز ضیاء تھوڑا ڈر رہا تھا' بظاہر گھر میں اس کی کافی اچھی ریپوٹیشن تھی' مگر اکیلے پروجیکٹ کا یہ اس کا پہلا کام تھا اور فیضی بھائی بظاہر اسے بہت سپورٹ کرتے تھے' مگر بہت جلد اس کے مخالف بھی ہو جاتے تھے' اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کوئی بڑا بلینڈر نہ ہو' مگر حمزہ ولی بات سنبھال چکا تھا' سو وہ اب مطمئن تھا۔ پھر شام کو جب وہ شوٹ سے لوٹ رہے تھے کہ پھر سے باری رضا نے اخبار کی خبر پر ہنسنا شروع کر دیا' وہ کسی اداکارہ کے عمرے کی خبر پڑھ کر ہنس رہے تھے۔

"اور عمرہ؟"

"ان کی کیا بات ہے بھئی' سبی ہے ان کی زندگی' رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔"

ایاز ضیاء بھی ہاں میں ہاں ملانے لگا اور وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

اور اس کے گرد اس لڑکی کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"میری ماں کہتی ہے اللہ بڑا رحم والا ہے' سب کچھ معاف کر دیتا ہے' مگر غرور کو کبھی نہیں معاف کرتا۔"

"غرور کیا ہے تمہاری نظر میں؟" اس نے پوچھا تھا اور وہ سر جھکائے بولی تھی۔

"غرور کا مطلب ہے اپنے سے کسی کو حقیر سمجھنا' کم تر جاننا۔ آپ کسی کو ذلیل سمجھتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے آپ خود کو اس سے افضل سمجھتے ہیں اور افضل صرف اللہ کی ذات ہے' جسے چاہے دونوں ہاتھوں سے دے' جسے چاہے ساری عمر اس وہم میں رکھے کہ اس کے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں اور بعد کو کھلے اس کے تو دونوں ہاتھ خالی رہ گئے اور کوئی میری طرح ہو' خالی ہاتھ دکھائی دے تو چپکے سے وہ کہیں سے بہت ساری جزا میرے ہاتھ پر لا رکھے یہ تو اللہ کو پتا ہے نا!"

"تم یہ ماڈلنگ چھوڑ کر نئی زندگی کیوں نہیں شروع کر دیتی ہو؟" اس نے متاثر ہو کر کہا تھا اور وہ کھلے لہجے میں بولی تھی۔

"ہر نئی زندگی کچھ عرصے بعد پرانی لگنے لگتی ہے' اتنی مشکل سے تو یہ زندگی جینا سیکھی ہے' اب کیا نئے بکھیڑے میں پڑوں۔"

"تم بہت اچھی لڑکی ہو میری دعا ہے' دل سے دعا ہے' تم کو ایک مکمل زندگی ملے' کسی ناراض دوست کی طرح جو اچانک آجائے اور آکر تمہیں منا لے جائے۔"

"آپ بھی بہت اچھے انسان ہوں مسٹر حمزہ ولی! ویسے کیا آپ پہلی بار اتنی جلدی ہر ایک سے فرینک ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں' مگر تم جس طرح بیگ میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں' مجھے لگا تم بھی میری طرح اپنے آپ باہر کھو کر کہیں اندر ڈھونڈ رہی ہو۔ سو دل چاہا تم سے دل کی باتیں شیئر کروں۔"

"آپ کو کیا لگا' پھر مجھ سے بات کر کے؟"

"یہی کہ ہر انسان اندر سے ایک برگد کا درخت ہے اور ایک گہرا سمندر جیسا ہر سطح ایک نیا راز' ہر شاخ ایک نئی واردات۔"

"تم کیا سوچ رہے ہو۔ کہیں تمہیں پسند تو نہیں آگئی وہ سستی لڑکی؟ اگر ایسا ہے تو میٹنگ فکس کروا دوں' یہ لڑکیاں ایک خوبصورت سے ڈنر ایک اچھے پیکج پر آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔"

"باری بھائی! سردی کی دھوپ کیسی لگتی ہے؟" اس نے جیسے سنا نہیں اور نیا سوال کیا۔

"اچھی لگتی ہے انوکھی سی' مگر زندگی کا لطف دیتی ہوئی۔"

"وہ بھی سردی کی دھوپ سی لڑکی ہے' انوکھی سی مگر زندگی کا لطف دیتی ہوئی۔" باری رضا قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے تھے۔

"گئے بھئی تمہارے یہ حمزہ ولی! تو تم ٹھیک کہتے ہو' اسے سردی بہت لگتی ہے دیکھ کہیں سردی سر پر تو نہیں چڑھ گئی۔"

ایاز ضیا نے اس کی طرف شرمندگی سے دیکھا' مگر اس نے سر جھکا لیا۔

وہ سردی کی دھوپ سی لڑکی اس کے دل میں اللہ کی محبت کا دیا جلا گئی تھی۔ وہ جو کچھ سوال لے کر کب سے پھرتا پھر رہا تھا آج مطمئن تھا اور اس نے اپنے میلے دل کی دعا میں اس کو دل سے خوش ہونے کی دعا دی تھی۔

"ہم کسی کے لیے اچھی دعا کریں' کسی کو سہارا دیں' کسی کے آنسو پونچھیں تو بس یہ ہی عبادت ہے' یہی نیکی ہے' اور....."

وہ نیکی اور عبادت آج دونوں چیزیں ایک دنیا کی نظر میں سب سے کم تر لڑکی کی باتوں سے سیکھ گیا تھا' وہ جو بقول باری بھائی کے "بازاری لڑکی" تھی' جس نے آدھی سچی' آدھی جھوٹی ایک ماں تراش رکھی تھی' جس نے ماں کے روپ میں کبھی محبت نہیں دیکھی تھی اور بس کتابی باتوں سے ایک کردار تراشا تھا اور اپنے دل کی ہر اچھی بات کو اپنے اس کردار سے منسوب کر کے جتنی مشہور تھی' وہ لڑکی اسے محبت' اور اللہ کے راستے کی سمت دے گئی تھی۔ اور اس کا دل تھا کہ یقین کرنے لگا تھا کہ کوئی نہ کوئی منزل اس کی بھی منتظر ہے۔

☼

سعدیہ عزیز آفریدی

جب اسے پہلی ٹھوکر لگی وہ اٹھارہ برس کی تھی۔ زندگی اس کے لیے بہت سادہ سی تھی۔ گھر اور چار دیواری کے علاوہ اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا مگر جب زندگی نے آنکھ چار کی تو اس کے سامنے کرم دین تھا۔ گاؤں کا سب سے اوکھا لڑکا جس کی نظر میں کسی کی اوقات چڑی سے زیادہ نہیں تھی اور ہوا یہ کہ وہ کرم دین اس پر مرمٹا۔ سہیلیاں اس کی قسمت پر رشک کرنے لگیں اور وہ اترائی اترائی یوں پھرتی جیسے کسی نے تاج محل کا اک کونہ ہی بس اس کے نام کر دیا ہو۔

تاج محل جمیلہ کے منگیتر نے پچھلی عید پر چپکے سے تحفہ دیا تھا اور وہ اس کانچ کے تاج محل کو دیکھ دیکھ کر اس محل کے ایک کونہ بھر کو اپنے نام کرنے کی دعا کرنے لگی تھی زندگی نے یہ دعا قبول کی محبت اس کے لیے ہاں ' ہاں اور صرف ہاں تھی اور یہیں اس نے ٹھوکر کھائی تھی۔

بڑا نوالہ کھانے سے حلق میں پھنس جاتا ہے اور چھل کر اترتا ہے اور محبت کا یہ بڑا لقمہ اس کے حلق چھیلتا ہوا اترا تھا۔

بدنامی سر میں خاک کی طرح آکر چمکنے لگی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

کرم دین گاؤں سے غائب ہو گیا تھا۔ ابا نے اس کو چالیس سال کے دو بچوں کے باپ سے بیاہ دیا۔ وہ چپکے سے گھر سے نکال دی گئی تھی جہاں گئی وہاں بھی عزت سے خالی تھا۔ دن رات اسے مارتے پیٹتے دن یہ دن آئے اور گزر گئے۔ اس کے ہاں پہلی اولاد نے دکھ کی طرح جنم لیا اور ماں کی حسرت پر ٹھنڈی سانس بن گیا۔

وہ روئی پھر ہنسی پھر روئی مگر دامن خالی کا خالی رہا۔ آنسو' ہنسی سب ایک چھوٹی سی قبر میں جا کر بسیرا کر بیٹھے۔

"یہ پاگل عورت اپنا آپ نہیں سنبھال سکتی میرے بچے کیا سنبھالے گی۔"

شوہر اسے واپس گھر چھوڑ گیا اور وہ گھر کے اندر پھر سے گم ہو گئی۔

گھر کو شیشے کی طرح چمکاتی رہتی۔ ماں دوپٹے میں منہ دے کر روتی رہتی۔

"میری بچی پگلا گئی ہے۔"

باپ گھور کے دیکھتا' نعمت نام لے اس جنم جلی کا۔ یہ پگلا نہیں گئی ہے۔ ہم سب کو پاگل بنا رہی ہے اگر دنیا کی خبر نہیں ہے تو اس کی قبر پر روز کیوں جاتی ہے۔ یہ کون جانے وہ کون ہے۔"

"کیوں نہ جانے گی کہ وہ کون ہے رجو کے ابا' وہ ماں ہے ماں۔ پر تو کیا سمجھے گا عورت کا دکھ۔"

ابا نے منہ موڑ کر دو تین مغلظات بکیں۔ چین نہ آیا تو جو پانی پینے کو منگایا تھا۔ وہ گلاس اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

"ہائے ماں۔۔۔!" وہ وہیں بیٹھ گئی۔

ماں بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی مگر وہ دوپٹہ آگے کر کے ماں سے کچھ بولے بغیر اٹھ گئی تھی۔ ماں نے اس کی کمر کو دیکھا اور پھر سے رونے لگی۔

"کوئی کیوں نہیں سمجھتا' یہ ماں ہے۔"

عورت ماں بن جائے تو روح بن جاتی ہے' یہ بھی روح بن گئی ہے۔" اس کے چھوڑے ہوئے شوہر کے بچے کبھی کبھی اس سے چوری کی طرح وقت چرا نے آجاتے تھے۔ اس دن وہ ان کے لیے گرم گرم آلو بھرے پراٹھے بناتی جی بھر کے ان کی من مرضی سے وقت انہیں دیتی اس دن لگتا رجو پھر سے ٹھیک ہو گئی ہے۔

باپ ایسے میں دیکھتا تو کہتا "اب جنون کہاں گیا پاگل پن یہ لڑکی تجھے اور مجھے پاگل بناتی ہے تا کہ ہم اسے کچھ نہ کہیں۔ کبھی تجھے

ماں' مجھے تو یہ چڑیل لگتی ہے چڑیل کھا گئی مری پرکھوں کی عزت کو۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔" کرتی ماں منہ پر دوپٹہ رکھ کر حیران رہ جاتی اور وہ ان سے بے پروا ہو کر زندگی بتاتی پھر یہ کوئی سات برس کی بات تھی جب اچانک گاؤں میں کرم دین اپنی بیوی کے ساتھ واپس آیا۔ وہ اس سے جان کر بچتا پھر رہا تھا' دوستوں نے سات سال کی کہانی کہہ سنائی تھی۔ وہ بچے کی قبر پر بیٹھی تھی جب وہ آیا تھا۔

"ابھی تک نہیں بھولی اس غلطی کو۔"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا مگر ایک لفظ نہ کہا۔

"سنا ہے تیری شادی ہو گئی ہے۔۔۔" کرم دین نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ہو گئی ہے' میرا ایک بیٹا ہے' اس کا نام زمان رکھا ہے میں نے بہت خوب صورت ہے۔"

"پاگل۔۔۔!" وہ ہنسا بہت بڑی بات تھی کہ اسے پرانی کہانی کا اتنا اہم کردار اسے بھول گیا تھا۔

"تجھے پھر محبت ہوئی کبھی۔"

"میں نے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے تو عشق کیا تھا اور عشق اک بار ہوتا ہے۔ پر تو مرد کی ذات۔ تو کیا جانے۔ عشق کیا ہوتا ہے۔ تیرا عشق تو سر سے لے کر پیر تک دائیں سے بائیں صرف خود تو ہی ہے پھر تو کیا سمجھے گا' عشق کیا ہوتا ہے؟

عورت عشق کرلے ناں تو سر سے پیر تک زماں و مکاں سے حرف و بیان تک ہر چیز سے نکل جاتی ہے پھر وہ عشق میں مکمل ہو جائے تو روح بن جاتی ہے اور روح سے تجھ جیسے حریص دنیا کوئی مزہ نہیں لے پاتے۔ دیکھ میں بیٹھی ہوں اب ہے تجھ میں ہمت' چھو کر دکھا۔"

کرم دین نے تمسخرانہ انداز سے اس کی طرف قدم بڑھائے مگر کوئی طاقت تھی جس نے اس کی انگلیوں کے لمس کو اس کا بدن چھونے نہیں دیا' وہ بھاری وجود سے کھڑا تھا۔

"سات سال سے تیری اولاد نہیں ہوتی۔ تیری اولاد تو یہاں دفن ہے ناں' ہے تجھ میں ہمت اقرار کرنے کی۔" اس کی بیوی اس کی پشت پر کھڑی اس کی زندگی کا سچ سن رہی تھی۔ وہ اٹھ کر وہاں سے گھر آگئی۔

گھر میں ماں نہیں تھی۔ باپ لاچار پڑا تھا اور وہ اس کے لیے گرم گرم یخنی بنا کر لائی تھی۔

اس نے باپ کو اٹھایا۔ بہت محبت سے منہ دھلایا اور ابا کی آنکھ میں آنسو تھے۔

"میں کہتا تھا تو اللہ لوک نہیں ہے تو چڑیل ہے پر تو تو ماں ہے۔ میری' رجو! میرے سر پر تیرا سایہ ہے۔ سدا رہے۔ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ اللہ معاف کر دیتا ہے پر ہم رذیل انسان نہیں چوکتے' غلطی پر طعنہ دیتے رہتے ہیں پر تو نے کبھی اف نہیں کی۔ رجو! تو نے کبھی اف نہیں کی۔ تو واقعی روح ہے پوری کی پوری روح۔۔۔"

رجو کچھ کہے بغیر ابا کو پانی دے کر پنکھا جھلنے لگی۔

"میری ماں مجھے بھول گئی پر تیری شکل۔۔۔" ابا کی آنکھیں پھر سے جھلملانے لگی تھیں۔

آج اس کی آنکھ میں بھی آنسو تھے مگر آج اس کی آنکھ میں نرمی تھی شعور تھا۔ زندگی نے اسے طعنہ دیتے دیتے تمغہ لگا دیا تھا۔

وہ ماں کہلانے لگی تھی۔

وہ روح بن گئی تھی اور روح کو طعنے دو' تمغے لگا دو یا زندہ جلا دو۔ اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ☼

سعدیہ عزیز آفریدی

وہ بہت تھکے ہوئے انداز میں بس میں بیٹھے تھے۔ اردگرد سے بے پرواہ لوگ بھانت بھانت کی باتیں کر رہے تھے مگر ان کی توجہ کسی طرف نہیں تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں جی؟" ان کے قریب ایک وجود آکر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے آپ کو کوئی خوشی نہیں دی ساری زندگی بس محنت اور صبر۔"

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔" اس وجود نے بہت محبت سے کہا۔ اور وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولے تھے۔ "ہاں مگر مجھے اپنے آپ سے بہت گلہ ہے جو سوچا تھا اس کا ایک پل بھی نہیں جیا۔"

"لیکن ہم خوش تو ہیں نا' دیکھے آپ ہیں ہمارے دو بچے ہیں اور وہ اچھا پڑھ رہے ہیں۔"

"مگر مجھے لگتا ہے۔ انہیں مجھ سے بہت سے گلے ہیں' وہ بظاہر کچھ نہیں کہتے مگر....."

"آپ کی غلط فہمی ہے' وہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں' آج کل کے دور میں ایسی اولاد ہونا قسمت کا کمال ہے اور بس۔"

انہوں نے آنکھیں کھول کر واپس بس کی کھچا کھچ میں خود کو اس شور میں گونجتے ہوئے پایا۔ ان کا اسٹاپ آچکا تھا اور وہ دھیمے قدموں سے اپنے گھر کی سمت چل رہے تھے۔ یہ گھر ابا نے اچھے وقتوں میں بنالیا تھا' لیکن دل میں کبھی کبھی ہمک اٹھتی تھی کہ اس میں ایک ٹیرس ہوتا اور کین کی کرسیاں جس پر براجمان ہو کر وہ شام کی چائے پیا کرتے' کبھی سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھا کرتے۔

ان کی شادی کوئی محبت کی شادی نہیں تھی' بالکل خاندان سے باہر کی لڑکی تھی ان کی بیوی' لیکن جب ان کے گھر میں آئی تو لگا کوئی بہت اپنا تھا' جسے قسمت نے ان کے گھر کا رستہ بتا کر بھیج دیا ہے۔ پھر رہتے بستے وہ کب ان کے وجود کی پرچھائیں بن گئی پتا ہی نہیں چلا' انہیں شاعری کا شغف تھا اور رابعہ کو شاعری سننے کا' یہی وجہ تھی کبھی کبھی رات میں وہ' ابا اور رابعہ بیت بازی کی محفلیں سجاتے۔

اماں قطعی ایک گھریلو خاتون تھیں' سو وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے اس سارے ماحول سے لطف لیتی رہتیں۔ وہ صابر اور قناعت پسند تھیں۔ یہی وجہ تھی ان میں بھی یہی گن آئے تھے۔ وہ جس سیٹ پر تھے' اس سیٹ سے لوگوں نے آدھا شہر خرید لیا تھا' لیکن ان کی ایمان داری یہ چٹخارے نہ لے سکی اور آج کل ان کی ملازمت کا آخری سال چل رہا تھا اور وہ کچھ ڈپریس رہنے لگے تھے۔ گھر کے معاملات رابعہ کس طرح چلا سکتی تھیں' ان کی پنشن سے' یہی سوچ سوچ کر ان کا آدھا وجود اس سوچ میں اٹک گیا تھا اور آدھا ان کے ہمراہ چلتا پھر رہا تھا۔

"آپ کو کیسے لگا کہ آپ یہ نوکری کرلیں گے۔ بابا کو پتا چلا تھا۔" انہیں بڑے بیٹے کے کمرے سے آنے والی آواز نے چونکا دیا تھا۔

"تم بابا کو ابھی مت بتانا' پہلے میں سمجھ تو لوں۔ اتنا مشکل کام نہیں ہے آؤٹ کرنا' پھر شام سے رات تک کا وقت ہے۔ جاب کا کوئی مسئلہ نہیں بنے گا۔"

ایک بات ان سے چھپائی جارہی تھی تو وہ بھی نظر انداز کرکے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

پھر رات کا کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا' یہاں تک کہ نوکری کرتے ہوئے پچیس سال بعد ان کے پاس ایک اور فائل ہمیشہ کی طرح آئی تھی ان کے ایک بہترین کمنٹ پر اکٹھے دس لاکھ ملنے والے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں دو سونے کی چوڑیاں تو پہنا دوں۔ تمہارے لیے کوئی نئی ساڑھی خریدے بھی عرصہ گزر گیا۔"

وہ مسلسل سوچ رہے تھے اور فائل گھر لے آئے تھے۔

بڑے بیٹے کو جاب پر جاتے ہوئے ایک ہفتہ ہونے والا تھا' اب وہ آہستہ آہستہ انہیں اپنی نوکری کا بتا چکا تھا اور چھوٹا بیٹا جو فارغ وقت میں ایک اخبار میں نیوز رپورٹر بن گیا تھا۔ گھر قدرے بہتر انداز میں چلنے کی پوزیشن میں آگیا تھا۔ وہ تھوڑے سے خوش سے تھے۔

"آپ کو پتا ہے جب میں بس میں بیٹھتا ہوں تو اپنے اسٹاپ پر آنے کے وقت جو اپنے پورے وجود کی تحریک بازو اور قدموں پر ڈالتا ہوں تو میرے اندر سفر کے ختم ہونے کی اپنے گھر لوٹنے کی جو سرخوشی ملتی ہے' وہ میں آپ کو بتا ہی نہیں سکتا' وہ ایک لمحہ ہی سارے سفر کی تھکن مٹا دیتا ہے' مگر جب بے تابی سے گھر آتا ہوں تو وہ سارا جوش بند دروازے سے ٹکرا کر مرجاتا ہے۔ تم دروازہ بند کیوں رکھتی ہو۔"

انہوں نے ایک بار کہا تھا تو جب سے رابعہ دروازے پر ان کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ حالات خراب تھے' دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا' لیکن آج جب وہ اندر آئے تو انہیں لگا وہ چپکے سے اپنے اندر ایک چور کو چھپائے ہوئے گھر کے اندر لے آئے ہیں' گھر کے سارے راز اور راستے اسے بتاتے ہوئے۔

وہ فائل لے کر بیٹھے ہوئے تھے' جب انہیں اپنے

نیوز رپورٹر بیٹے کی بے تاثر مگر دو ٹوک آواز سنائی دی۔
"سوری مسٹر حمید! آپ جانتے ہیں میرے لیے اخبار زرد صحافت اور اسٹیٹس کمانے کا ذریعہ نہیں ہے۔ دولت بہت ضروری سہی اور آج کے زمانے میں تو اور بھی بہت ضروری ہے۔ ہر انسان کمانا چاہتا ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں' میں جو دنیا میں نیک نامی کماؤں تو میرے رزق کی ذمہ داری اس اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں ایک عاجز بندہ ہوں' کہاں کہاں اپنا رزق کمانے ڈھونڈنے نکلوں گا' میں سمجھتا ہوں اپنا ہاتھ اپنے اللہ کو تھما دوں پھر راستوں اور منزلوں کی ذمہ داری سب اس کی ہے' مجھے اعتبار ہے کہ جو اور جتنا رزق ہے مجھے ملے گا۔

میرا کام محنت کرنا ہے اور رپورٹنگ۔۔۔ میرے بابا نے ایک بار کہا تھا بہت کٹھن کام کی ذمہ داری انھار ہے ہو' اگر سچ کہنے اور سچ آگے تک پہنچانے کا حق ادا کر سکتے ہو تو ہی اس راستے پر قدم رکھو اور مسٹر حمید! ایمان داری اور دیانت داری مجھے میرے بابا سے وراثت میں ملی ہے۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ رابعہ ان کے لیے چائے لیے کھڑی تھیں۔
"آپ کو پتا ہے' جب میں بس میں بیٹھتا ہوں تو اپنے اسٹاپ آنے پر میرے سارے وجود کا جو سارا زور ہاتھوں اور پیروں پر ہوتا ہے تو سفر ختم ہونے کی جو سرخوشی ہوتی ہے وہ سرخوشی کا لمحہ بہت انوکھا سا ہوتا ہے۔"

انہوں نے رابعہ سے پھر سے غیر متوقع کہا تھا۔ اور اس وقت ان کے چھوٹے بیٹے نے ان کے کندھوں پر زور ڈال کر کہا تھا۔
"یہ سفر ختم ہونے کی ایک الگ خوشی ہوتی ہے بابا! لیکن اگر آپ کے سفر کی مہک اور آپ کے سفر کے تجربات کوئی اور دل سنبھالے آگے قدم بڑھائے' جہاں سے آپ نے سفر ختم کیا ہے تو منزل کسی کو بھی ملے منزل ملنے کی خوشی جزا کی طرح اس پہلے دل تک ضرور پہنچائی جاتی ہے۔"
"بہت بڑی بڑی باتیں کرنی آگئی ہیں تمہیں۔"
"سب کچھ آپ سے سیکھا ہے بابا! میرے عام سے بابا خاص باتیں کرنے کا ہنر آپ سے بڑھ کر کون جانے گا۔"

"اور مجھے پتا ہے' وہ دروازہ بند ہونے کی رنجش بھی ابھی تک آپ کے دل میں ہے نا؟"
بڑا بیٹا بھی اچانک ہی باتوں میں شامل ہو گیا تھا' پھر نرمی سے ان کے ہاتھ تھام کر بولا تھا۔
"یہ بند دروازہ تب کھلتا ہے' جب آپ گھر میں داخل ہونے کی سرخوشی خود سے منانا چاہتے ہوں۔ مگر بند دروازہ زندگی کی مثال بھی تو ہے۔ بابا اس کے کھولنے والے ہاتھوں کا انتظار اور آپ کو دیکھ پانے کی جو چمک ہے وہ پہلے سے کھلے دروازے سے اندر نہیں جھانکتی' زندگی بند دروازہ سہی' مگر جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بند دروازہ بھی کھلنے پر مایوسی نہیں لاتا۔ بس اللہ کے فیصلوں پر اعتماد اور اس کی رحمت کا یقین ہی تو زندگی کی کہانی کا ذائقہ ہیں۔ مجھے اپنے اللہ پر آنکھ بند کر کے یقین ہے اور اللہ پر جو لوگ آنکھ بند کر کے یقین کرتے ہیں' جو سوال نہیں اٹھاتے اعتراض نہیں کرتے وہ کبھی اندھیرے راستوں میں ٹھوکر کھا کر نہیں گرتے' کوئی ہوتا ہے جو انہیں سنبھال لیتا ہے۔" ان کی آنکھ کا نم پھیلنے لگا تھا۔
"بھلے سونے کی چوڑیاں نہ سہی' مگر ان ہاتھوں میں جب کانچ کی چوڑیاں بجتی ہیں تو نامحسوس محبت کی صدا دیتی ہیں اور یہ محبت کی صدا دولت کی امارت کی محتاج نہیں۔"

انہوں نے فائل کو دراز میں ڈال کر اس لمحے کو پوری طرح جینا چاہا تھا اور انہیں لگا تھا ان کی ساری تھکن اس ایک لمحے میں اتر گئی تھی' وہ ایک بار پھر سے تازہ دم ہو گئے تھے۔

☆

سعدیہ عزیز آفریدی

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے دنیا کی ہر آسائش میسر ہے' زندگی کی رعنائی' خواب' رنگ' روشنی' لائم لائٹ' سب کچھ مگر کوئی چیز ہے۔ جو میرے اندر مس ہو گئی ہے' ذائقہ' بدمزگی بن کر میری زبان میں ہی نہیں میری روح تک میں گھل گیا ہے۔ میں نہیں دیکھوں تو لگتا ہے کہ آنکھ کسی کو ترس رہی ہے' پتا نہیں وہ کون ہے جسے میں سننا چاہتا ہوں' کون ہے جسے میں دیکھنا چاہتا ہوں' میرے اندر مسلسل اسپارکنگ ہے' مگر کون ہے وہ مجھے کبھی گمان نہیں گزرتا۔

میری آنکھوں میں بھی بہت خواب بھرے ہوئے تھے' میری بینائی کو آنکھ میں جگہ نہیں ملتی تھی پاؤں دھرنے کی' اور اب میرے سارے خواب سامنے تعبیر کا روپ پہن کر بیٹھے ہیں' مگر مجھے اپنی آنکھیں اندر تک سے خالی لگتی ہیں' میں نے زندگی کو زیرو سے شروع کیا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں زیرو کچھ نہیں ہوتا اور میں سمجھتا تھا زیرو وہ ہندسہ ہے۔ جو کسی بھی ہندسے کے ساتھ مل جائے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور میں نے زندگی اسی زیرو سے شروع کی' ایک خواب کی سیڑھی لگائی' دوسرے خواب تک پہنچا' دوسرے خواب سے تیسرے خواب تک اور پھر وہ زیرو ضرب در ضرب ہو کر ہندسے سے ہندسہ ملاتا ایک ملین بنتا چلا گیا۔

لوگ مجھے دیکھتے اور حیران ہوتے۔ تم نے جو سوچا وہ حاصل کیا؟

پہلے میں یہ جملہ سن کر فخر اور کمینے سے غرور سے اکڑ جاتا تھا' مگر اب میرے اندر یہ جملہ ایک حسرت کی دھیمی آگ کی طرح دہکنے لگتا ہے اور آج میں اسی آگ کی تپش سے گھبرا کر اس پارک میں آیا تھا مجھے بیٹھے ہوئے کافی دیر گزر گئی تھی' جب ایک دوسرا فریق میرے قریب آکر بیٹھا تھا' ہم دونوں میں کافی دیر تک خاموشی بولتی رہی تھی' پھر پہل انہوں نے کی تھی۔

"آپ کا نام بیٹا۔"

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ پچاس کے لگ بھگ ایک متناسب سے انسان تھے' ان کے چہرے پر سکون اور اطمینان دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی' اتنی نفسانفسی میں بھی کوئی مطمئن اور خوش رہ سکتا ہے۔

"کیا ہوا نام یاد نہیں آرہا کیا؟ ارے بیٹا جی اتنی مصروفیت بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"جی نہیں میں ویسے ہی کچھ سوچ رہا تھا' ویسے میرا نام عباس شاہ ہے۔"

"اوہ نام تو آپ کا بہت پیارا ہے' مگر اتنی سی عمر میں اتنی سوچیں کیا واقعی کتابیں عمریں بڑھا دیتی ہیں۔"

"پتا نہیں سر میں نے کبھی کتابوں کو علم کے لیے نہیں پڑھا' صرف ڈگری کے لیے پڑھا اور جب نیوز میں گیا تو مجھے نیو ٹیکنالوجی اور معلومات سے اس لیے ٹچ رہنا پڑتا ہے کہ یہ میری ملازمت کو زیادہ بہتر طور پر سیکیور کرتی ہے۔"

"یہ تو بری بات ہے علم تو خود اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ صرف یہ اگر آپ کی زندگی میں ہو تو آپ جہالت کی پٹی بندھے بندھے مر نہیں سکتے۔" انہوں نے ایک لفظ نکالا اور میں نے اسی سے نئی بات نکالتے ہوئے کہا۔

"جہالت دو طرح کی ہوتی ہے سر! ایک تعلیم کی کمی سے اور ایک علم کی کمی سے' بہت سے لوگ ہیں جو ڈگریاں لے لیتے ہیں' مگر ان کے پاس علم نہیں ہوتا اور کچھ لوگ علم حاصل کر لیتے ہیں' مگر پھر بھی ان کی آنکھوں پر اپنے معنی کی پٹی اور کانوں میں من مرضی کا موم پڑا ہوتا ہے جس کو کسی اور کی بات کسی اور کا علم کبھی نہیں پگھلا سکتا۔"

"سوچتے ہو گڈ یہ اچھی بات ہے سوچنا تکلیف دہ سہی' مگر سوچنا زندگی کو بڑھاوا دینے کے لیے ضروری ہے۔" انہوں نے مجھے سراہنے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولے۔

"تھک گئے ہو؟ وجہ جان سکتا ہوں۔ تم جیسی عمر کے تو پیروں میں بھنور لے کر چلتے' طوفانوں کو ہاتھوں سے موڑنے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے تمہارے اندر کوئی بات تھکن بن کر بیٹھتی جا رہی ہے...

بچوں سے محبت کرتے ہو۔" انہوں نے یکدم بات کا پانسہ پلٹا اور میں یکدم ٹھٹک گیا۔ یہ سوال۔ یہ سوال ہی تو میرے اندر کسی یتیم بچے کی بے چارگی کی طرح سکڑا سمٹا بیٹھا تھا میں جس سے بچتا رہتا تھا۔

"سنو تمہیں بچے کیسے لگتے ہیں' مجھے بچے بہت پسند ہیں میں نے تو ان کے نام بھی سوچ لیے ہیں۔" کوئی ہوا کی سرسراہٹ کی طرح میری رگ و پے میں پھیل گیا۔

یہ خاموشی صم بکم سوال اور بات ایک دم سے کیوں بولنے لگی تھی۔

"شائد تمہیں بچے بہت پسند ہیں' مگر ہم اتنی جلدی فیملی نہیں بنائیں گے' ابھی بہت کچھ انجوائے کرنا ہے' بہت کچھ' دنیا کو سمندر کی تلاطم خیز لہروں کی طرح محسوس کرنا ہے' پیروں کو طوفانوں کے بھنور سے کھیلنے دو' زندگی کو ابھی گانے دو' جی بھر کر مسکرانے دو۔" میں نے نہیں سوچا تھا مگر میرے اندر کا عباس شاہ ماضی کا ایک منظر زہر کی طرح پی کر اپنے گلے پر ہاتھ رکھے جاں کنی کی حالت میں تڑپنے لگا تھا۔

"کیا ہوا کچھ یاد آگیا کیا۔" انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے' مگر میں کچھ کہے بغیر اٹھ گیا' پھر برگد کے ایک درخت کے نیچے سے نکل رہا تھا جب کوئی سرگوشی میں پکارا تھا۔

"میرا پیار برگد کے درخت کی طرح تم سے قدیم ہے' تم کبھی مجھے چھوڑنا چاہو گے تو بھی مجھے یقین ہے مجھے بھول نہیں پاؤ گے اور اگر میری یاد کو کسی کونے میں رکھ کر بھول گئے تو یہ یاد رکھنا تمہاری مسکراہٹ اور تم دونوں میری سگی سہیلیاں ہیں' میرے ساتھ ہی تمہاری زندگی سے رخصت ہو جائیں گی۔ تم جب بھی برگد کے درخت کو دیکھو گے تو تمہیں میرا قدیم پیار یاد آئے گا' میری محبت کا سایہ تمہیں کسی اور کا نہیں ہونے دے گا۔" میں نے سر جھکا لیا یہ باتیں دل نے کہاں چھپا کر رکھی تھیں اور آج کس نے اس یاد کے صندوق کا قفل توڑا تھا۔

میں گھر میں آیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسٹور روم میں گیا تھا' میری بیوی حیران ہو گئی تھی۔

"آپ کو ڈسٹ الرجی ہے آپ وہاں کیوں جا رہے ہیں۔" وہ میرے پیچھے لپکی تھی' مگر میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

میں نے ایک دراز کا قفل کھولا تو ایک لڑکی مسکراتی ہوئی پوری کی پوری باہر نکل آئی' کسی گہرے سمندر کی طرح چپ اور گہری آنکھیں سمیٹے ہوئے۔

"تم مجھے کبھی چھوڑو گے تو نہیں۔" کتنا سہما ہوا انداز تھا اس کا اور میں ہنس پڑا تھا اس کے خوف سے۔

"میں کبھی تجھے بھی چھوڑ سکتا ہوں' تو نے یہ بات سوچ کیسے لی' دیکھ جس دن تجھے چھوڑوں نا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا تو میری زندگی کی آخری سانس کی جیسی ہے' جسے جان نہ لے سکتی ہے نہ چھوڑ کر جا سکتی ہے پگلی۔" وہ کیسے مسکرائی تھی۔

"تمہیں پتا ہے انسان دو طرح سے مرتے ہیں ایک ظاہری وجود میں مٹی میں مل کر مٹی ہوتے اور ایک بظاہر زندہ ہوتے ہیں' مگر کوئی دکھ' کوئی تشنگی کوئی گھٹن انہیں زندہ ہوتے ہوئے مار دیتا ہے' بس ان پر صلیبیں نہیں لگتیں' مٹھی بھر کر لوگ مٹی نہیں ڈالتے۔ چالیس قدم چل کر ان کے جزا و سزا کا فیصلہ نہیں ہوتا' بلکہ وہ ساری عمر ان چالیس قدموں پر خود لیٹے خود گھسٹتے رہتے ہیں اور لوگ ان کی کامیابی پر ان کو تمغے لگائے جاتے ہیں' سنو عباس شاہ تم اتنے عرصے سے مرے ہوئے ہو اور حیران پھرتے تھے کہ تمہارے اندر زندہ روح والی حرارت کیوں نہیں! سمجھے تم مر چکے ہو۔"

میں نے تصویر دراز میں رکھی اور اپنے سامنے الماری کے بے رونق شیشے میں خود کو دیکھا اور خود کو بہت بے چارگی سے پرسہ دیا' کسی ایسے شخص کی طرح جس کا کوئی عزیز نامعلوم موت اوڑھ کر سو چکا تھا اور وہ اسے زندہ سمجھ کر اس کی واپسی کے قدم شمار کر رہا تھا' میں باہر آگیا تھا اور میری بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

اس کا اور میرا تعلق صرف ضرورت کا تھا وہ حسین و جمیل تھی' میرے ساتھ چلتے ہوئے اچھی لگتی تھی' مجھے لوگ اس کی وجہ سے سراہتے تھے اور اس کے لیے میرا وجود اس لیے ضروری تھا کہ میں نیوز چینل کا ایک فیس پرسن تھا اور ماہانہ ایک لاکھ روپے کما رہا تھا اور یہ سب اسے مجھ سے جوڑنے کے لیے کافی تھا۔

"جا رہے ہو تم' جاؤ' مگر عباس میں تمہیں بددعا نہیں دیتی' مگر یاد رکھنا میرا اللہ تمہیں سب کچھ دے' بے تحاشا کامیابی دے سب کچھ تم جس چیز کو ہاتھ لگاؤ وہ مٹی ہے تو وہ بھی سونا بن جائے' مگر میری دعا ہے کہ آج کے بعد کوئی تم سے دل سے محبت نہ کرے۔ تم روح کی گہرائی کو سیراب کرنے والی محبت کو کبھی چکھ نہ سکو۔"

میں اس وقت کامیابی کے ہنڈولے میں تازہ تازہ سوار ہوا تھا' اس لیے مجھے یہ ساری باتیں مضحکہ خیز لگی تھیں' میں نے پلٹ کر کچھ نہیں کہا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔

مگر آج مجھے پہلی بار لگا تھا میں اس لمحے کے سرہانے کھڑا تھا اور بس سمجھ رہا تھا کہ سفر طے کر رہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور یکدم ایک چہرہ بھیگا بھیگا سا میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"پتا نہیں مجھے کیوں لگتا تھا میری محبت اتنی سچی' اتنی پاکیزہ ہے کہ تم اور تمہارا دل چاہے بھی تو اسے موڑ نہیں سکتے' مگر میں کتنی غلط تھی محبت اور میری محبت تو صرف غلط بھی نہیں نکلی' جسے ٹھیک کرنے یا مٹانے میں کچھ دیر لگتی ہے' تم تو میری محبت کے سمندر کی لہر بھی نہیں چھو سکے اور میں سمجھتی رہی تم محبت کا سمندر ہو جو جتنا تلاطم خیز ہوتا ہے اتنا ہی خاموش نظر آتا ہے۔ عباس کیا واقعی میں تمہیں کبھی یاد نہیں آؤں گی کبھی نہیں۔" کتنی حسرت تھی اس کے لہجے میں وہ میرے قریب آن رکی تھی۔

"ایک احسان کرو گے مجھ پر۔"

"کیا؟" میں نے بیزاری سے اس لمحے اسے دیکھا تھا اور وہ سر جھکا کر بولی تھی۔

"اپنا نام مجھ سے کبھی مت چھیننا۔ تم جہاں جانا چاہتے ہو جاؤ' جیسے جینا چاہتے ہو جیو' مگر میرے خیال نے جو تمہاری روح سے ایجاب و قبول کیا ہے میں چاہوں بھی تو اس بندھن سے نکلنا نہیں چاہوں گی۔

میں نکل ہی نہیں سکتی عباس' میری زندگی نے محبت کو تمہارے نام سے محسوس کیا' تمہارے نام سے جانا' پھر میں اب اور کسی مرد کے خیال کو چھونا بھی حرام سمجھتی ہوں۔"

"دنیا کے سامنے تم مظلوم بننا چاہتی ہو' تم چاہتی ہو لوگ مجھے تمہارا مقروض سمجھیں' مجھ پر انگلیاں اٹھائیں۔"

"لوگ ہمارے درمیان کیسے آگئے عباس جب ہم نے ایک دوسرے کو اپنا کہا تھا تب تم نے ہی تو کہا تھا لوگ تو زبان کے چٹخارے ہی چاہتے ہیں ہم ہنستے ہیں تو بھی وہ ہمارے بارے میں لفظ جوڑ کر کہانی بنا دیتے ہیں' ہم روتے ہیں تو بھی کوئی نہ کوئی افسانہ ان کا حسن خیال ترتیب دے لیتا ہے۔ اور بس ہماری محبت میں صرف ہم اور تم ہیں ہاں وہ محبت کا خدا۔

عباس میں بھی تمہیں یہی کہتی ہوں مجھے اس محبت کے خدا کے لیے ہی اپنا نام بخش دو' میں تمام عمر اس ایک لمحے کے لیے تمہاری مقروض رہنا چاہتی ہوں۔"

میں نے سر ہلایا تھا اور جدائی کے وہ کاغذ جن پر میں دستخط کرنے والا تھا' میں نے اس کے سامنے پھاڑ دیے تھے اور آج پورے چھ سال پانچ ماہ بعد مجھے اپنے اندر کا دکھ سمجھ آیا تھا جو مجھے نہ ٹھیک سے ہنسنے دیتا تھا نہ ٹھیک سے رونے دیتا تھا۔ آج میں آفس نہیں گیا تھا' میں نے آج شاہینہ کو ٹریس کرنے کی کوشش کی تھی' پھر دو ماہ بعد کہیں میں اسے پا سکا تھا وہ اب بھی پہلے جیسی تھی اسی نارنجی شام کی طرح جس شام نے اسے مجھ سے ملایا تھا۔ وہ میرے آفس میں میری کولیگ تھی' یہ میری پہلی جاب کی کہانی تھی اور اس زمانے میں' میں اپنے کھانے پر خرچ کرنے کو فضول خرچی سمجھتا تھا اور آہستہ آہستہ شاہینہ یہ بات سمجھنے لگی تھی' پھر وہ روز گھر سے کچھ نہ کچھ بنا کر لانے لگی' مجھے لنچ کی دعوت دینے لگی' میں نے اس احسان مندی کو بہت جلد مارک کر لیا تھا اور وہ فوراً بولی تھی۔

"نہیں عباس صاحب میں لنچ آپ کے لیے نہیں بناتی' بلکہ سمجھیے آپ کی وجہ سے ناصرف میں لنچ کرنے لگی ہوں بلکہ رات کو بھی گھر کا کھانا نصیب ہو رہا ہے مجھے ورنہ باہر سے لنچ باکس لینے اور رات کو فاسٹ فوڈ پر گزارا کرنے کی عادت ہو گئی تھی' میں دنیا میں تنہا ہوں' چائلڈ ہوم میں پلی ہوں اب اپنے پیروں پر کھڑی ہوں تو ایک گرلز ہاسٹل میں رہ رہی ہوں' اکیلے رہنے کا ویسے فائدہ ہے۔ انسان روتا ہے کسی دکھ سے تو کوئی ہنسنے والا نہیں ہوتا۔" مجھے اس کی ان باتوں نے بہت ہرٹ کیا تھا اور آہستہ آہستہ یہ باتیں میری عادت بنتی چلی گئی تھیں' میں اس کا سایہ بن گیا تھا اور پھر یہی سوچ تھی جو ہم نے باقاعدہ نکاح کر لیا تھا' رخصتی میرے اسٹیبلش ہونے کے بعد قرار پائی تھی اب میں بے دھڑک اس کے ہاسٹل میں آجا سکتا' مگر آج میں اسی ہاسٹل کے سامنے کھڑا تھا اور بہت دلگیر سا تھا۔

"شاہینہ ملک۔" پرانی وارڈن نے نئی طرح سے مجھے غور سے دیکھا۔

"آپ عباس شاہ ہیں وی ایچ چینل کے نیوز کاسٹر۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور شاہینہ ملک کا پھر سے پوچھنے لگا تھا۔

"وہ ایب نارمل ہو گئی' آپ کے جانے کے بعد پہلے وہ چیزیں رکھ رکھ کر بھولنے لگی' پھر ہاسٹل کا راستہ اور ایک دن وہ مجھے سڑک پر بیٹھی ہوئی ملی' لوگ اسے فقیرنی سمجھ کر بھیک دے رہے تھے' مگر اس نے پیسہ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا' سر میں نے اسے پکارا نام لے کر تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ تم جانتی ہو مجھے' میرا نام کیا ہے۔ میرا گھر کہیں گم ہو گیا ہے' میرے دو بچے تھے وہ بھی کہیں کھو گئے ہیں' تم مجھے بتاؤ نا میں انہیں کہاں ڈھونڈوں' تم تو مجھے جانتی ہو تو بتاؤ نا' میرا گھر اور میرے بچے کہاں ملیں گے۔" میری آنکھ میں آنسو آگئے تھے۔

"سر اس کی یہ بات سن کر میں نے ازراہ ہمدردی اس کا علاج کروانے کی کوشش کی' آپ کو ٹریس کرنے کی کوشش بھی کی مگر دونوں کام ادھورے رہ گئے' آپ شاید ملک سے باہر گئے ہوئے تھے' چینل کے کسی خاص کورس کے سلسلے میں۔"

"شاہینہ اب کہاں ہے؟" میں نے بدقت پوچھا اور وہ مجھے مینٹل اسپتال کا پتا بتانے لگی۔ میں اسی شام وہاں پہنچا تھا' پھر میں نے اسے کتنی سورس کے بعد ریلیز کروایا' یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں جب اسے گھر میں لے کر آیا تو میری بیوی کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"کون ہے یہ عورت' آپ تو اتنے صفائی پسند ہیں اور اتنی گندی مندی عورت کو کہاں سے لے آئے ہیں' آپ کو ڈسٹ الرجی ہے نا عباس۔" وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"تم تو کہہ رہے تھے تم جانتے ہو' میرا گھر کہاں ہے' مگر میرا گھر اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ وہ تو بس دو کمروں کا فلیٹ تھا' جہاں ایک کمرے میں میرے بچے رہتے تھے' تم تو میرے بچوں سے مجھے ملوانے کا وعدہ کر کے لائے ہو نا' مگر پتا نہیں مجھے کہاں لے آئے ہو۔" وہ پورے گھر میں پھر رہی تھی اور میں سائے کی طرح اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

"یہ کون ہے عباس۔" میری بیوی نے مجھے بازو سے پکڑ کر پھر یوں پوچھا تھا اور میں نے اس کے کاغذات والے بیگ سے اپنا نکاح نامہ نکال کر اسے دکھایا تھا' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ کی بیوی ہے۔" اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی اور میں نے سر ہلا کر کہا تھا۔

"ہاں واقعی میں یہ ہی میری بیوی ہے دیکھو تو۔ اس نے اس نکاح نامے کو اپنے آپ سے بھی زیادہ سنبھال کر رکھا ہے' ہر چیز رکھ کر بھول گئی' مگر یہ رشتہ' یہ بندھن آج بھی اس کے دل سے جڑا ہوا ہے' شہلا..... تمہیں نہیں پتا' لیکن میں جان گیا ہوں کہ ہماری اب تک اولاد کیوں نہیں ہوئی' ہمیں اس کی بددعا نے جکڑ رکھا ہے۔"

"کسی کی بددعا تباہ کرتی ہے' عروج تک نہیں لے جاتی۔" میری بیوی نے نخوت سے کہا اور میں کرلایا۔

"ہاں مگر اس نے مجھے عروج کی بددعا ہی دی تھی اس نے کہا تھا تم مٹی کو بھی ہاتھ لگاؤ تو سونا ہو جائے' مگر آج کے بعد کوئی تم سے سچے دل سے کبھی محبت نہ کرے اور شہلا تمہیں پتا ہے نا ایک دوسرے کے قریب ہو کر بھی ہمارے درمیان اس کی محبت بکل ڈالے کھڑی تھی میں سمجھتا رہا تمہیں میرے نام' میری دولت سے محبت ہے' مجھ سے نہیں اور تم سمجھتی رہیں مجھے تمہارے حسن و جمال اور جان محفل بننے سے لگاؤ ہے اور بس یہی ضرورت کبھی پوری محبت نہیں بن سکی' مگر میں اب اس غلطی کو سدھارنا چاہتا ہوں۔"

"جو دل چاہے کرو' آج سے پہلے کبھی تم نے میری سنی ہے جو اب سنو گے۔" وہ ہمیشہ کی طرح تن فن کرتی گاڑی لے کر باہر نکل گئی اور میں جھجکتے اس کے پاس گارڈن میں آگیا' وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اس نے اپنا سب کچھ ایک بار ہارا تھا' مگر اس ہار کی کسک بار بار اس کے وجود کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

"میں عباس ہوں' تمہارا عباس۔" اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا' کچھ نہیں بولی' مگر اس کے انہماک سے پتا نہیں مجھے کیوں گمان ہوا کہ جیسے اس رشتے' اس بندھن کی طرح وہ میرا چہرہ بھی شاید نہیں بھولی ہے۔ اور اگر بھول بھی گئی ہے تو بھی ابھی وقت تھا میرے پاس پھر سے اسے اپنے قریب لانے کا مجھے آج سمجھ آیا تھا۔

"محبت یا تو کچھ نہیں ہوتی یا سب کچھ ہوتی ہے" اور آج یہی محبت سب کچھ بنی شاہینہ کے وجود میں سمٹی بیٹھی تھی اور مجھے اس محبت سے اپنی بے رنگ زندگی کو رنگ دینا تھا۔

☼ ☼

سعدیہ عزیز آفریدی

محبت راہ دار میری

http:/

میں کوئی پروفیشنل رائٹر نہیں ہوں بس کبھی کبھی دل پشوری کرنے کو لکھ لیا کرتا ہوں۔ میں پروفیشن کے حساب سے صحافی ہوں۔ آپ دائیں بائیں آنکھیں مت گھمائیں کیونکہ میں بہت کم سچ بولتا ہوں اور یہ بھی ان ہی بہت سے جھوٹ میں سے نکالا ہوا سچ ہے کہ میں پروفیشنل رائٹر نہیں ہوں میرا دل کی بھڑاس کتھارسس یا سچ کی علم برداری کے کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں' ہاں بس میرے پاس صحافت کی ڈگری ہے اچھے اور نامی گرامی بزنس مینز اور سیاست دانوں کی پارٹیز میں اٹھتا بیٹھتا ہوں' لفظوں کو گھمانا' اٹھانا اور ان لفظوں سے بڑے بڑے قدوں کو گرانا آتا ہے مجھے' یہی وجہ ہے جو میری مہارت کے قائل ہیں وہ ہمیشہ برے وقت میں مجھے ہی رابطے کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں کیونکہ میں دوستوں میں دشمنی اور دشمنی میں دوستی کی چاشنی ملانے میں ید طولیٰ رکھتا ہوں۔

اس دن بھی میں ایسی ہی ایک تقریب میں تھا جب کسی نے مجھے آدی کہہ کر پکارا اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا "آدی" کے تخاطب پر میں نے سر جھٹک دیا بھلا میرے یار دوستوں کو کہاں اتنے اونچے طبقہ عالیہ میں بیٹھنے کا شرف و حوصلہ۔ وہ سارے دوست جو کالج میں بیٹھ کر سسٹم بدلنے کی باتیں کیا کرتے تھے وہ خود سر سے لے کر پیر تک بدل گئے تھے مگر ایک انچ اپنی مرضی سے نہیں بدل سکے تھے پھر میں کیسے سوچ لیتا کہ ان میں سے کوئی اس تقریب میں ہو سکتا ہے اور اچانک آدی کہہ کر مجھے بلا سکتا ہے۔

میں عادل انیس ہوں میرے دوست اور میری ماں صرف مجھے آدی کہتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے تو عادل سے آدی کا کوئی سابقہ لاحقہ ملتا جلتا نہیں نظر آتا مگر میری ماں کو بس پیار میں مجھے آدی کہہ کر بلانے کی اتنی عادت تھی کہ پھر کالج میں بھی سب دوستوں کو پیار کا یہ نام ازبر ہو گیا تھا۔

میں چکن لیگ پیس کے ساتھ مصروف تھا جب کسی نے بہت آہستگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

مجھے یہ حرکت بے حد بری لگتی تھی اور اس طرح کی دوستی صرف مرے ماضی کے مڈل کلاس دوستوں کی بری یاد کی طرح مرے ذہن سے چپکی ہوئی تھی میں جب اپنے نرم گدے پر بہت خوب صورت خیالات میں کھویا ہوتا تو اچانک ماضی پتا نہیں کہاں سے چلا آتا کچھ چیزیں آپ یاد نہیں کرتے بس خود بخود یاد آجاتی ہیں' کبھی آپ اچھا یاد کرنے بیٹھتے ہیں اور کسی تہ میں سے کوئی بری یاد آپ کو ڈنگ مار دیتی ہے اور آپ کبھی بھی اداس بیٹھے ہوں تو خوامخواہ دل چاہتا ہے کوئی اچانک آپ کو آکر چونکا دے' بھلے ہنسانہ سکے مگر چونکا تو دے تاکہ اس فیز سے دل منہ موڑ سکے۔

"آدی!" اب کہنے والا بالکل میرے سامنے کھڑا تھا میں نے یادداشت کو تھوڑا ہلایا جلایا مگر یہ چہرہ پھر بھی میرے حافظے میں ابھر کر نہ دیا۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے پھر بھی پوری عزت دی اور وہ چہرہ مسکرانے لگا۔

"ارے یار میں شہریار..... تجھے یاد نہیں بچپن میں ہم کیسے مل کر کنچوں کے میچ جیتا کرتے تھے۔"

"کنچوں کے میچ۔" میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بچپن کے قصے کہانیوں کو دوہراتا یہ الہ دین کا جن کہاں سے نکل آیا تھا۔

"تجھے یاد ہے آدی ہم ایک جملہ بولتے تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب ہم جن تھے۔" مجھے ہنسی آنے لگی' ایک ایسا شخص جس نے ارمانی کا سوٹ پہن رکھا تھا گوچی کے جوتے پہن رکھے تھے وہ کہاں ایران توران کی کہانیاں سنا رہا تھا اس جیسے لوگوں کے پاس کہاں ہوتا ہے اتنا ٹائم کہ وہ ایسی فضول باتوں پر توجہ دیں۔

"تمہارے پاپا گورنمنٹ سرونٹ تھے نا مسٹر انیس باقری کیا گریٹ انسان تھے۔"

اب مجھے کچھ کچھ یاد آرہا تھا۔ "ارے تم وہ شہریار ہو' شہریار سفیر جسے اماں تر نوالے کھلاتی تھیں اور کہتی تھیں ہائے او ربا جھونپڑی کے رہن سہن والا محلوں میں پیدا ہو گیا اور محلوں والا میرے گھر جما۔" وہ پھر سے ہنسنے لگا تھا۔

"ہاں ہاں میں وہی شہریار ہوں' حیرت ہے ویسے تجھے تو میری شکل سے ہی جلن ہوتی تھی پھر تو کیسے بھول گیا مجھے' بندہ اپنی زندگی سے جڑے دو لوگوں کو نہیں بھولتا' ایک وہ جو دوست ہو ایک وہ جو دشمن ہو۔"

"تو تمہیں جان لینا چاہیے تھا تم دونوں حوالوں سے میری زندگی سے آؤٹ ہو' میرے لیے کوئی چیز زیادہ معنی نہیں رکھتی سوائے اپنی ایک رائے کے' دنیا میں کیا نہیں جو بدلا جا سکتا اگر آپ کے پاس بدلنے کے لیے پیسہ ہو یا دماغ' ویسے پیسے کے مقابلے میں دماغ زیادہ جلدی سب کچھ بدل سکتا ہے کیونکہ دماغ ہی ہے جو الوژن بناتا ہے خواب دکھا سکتا ہے پروپیگنڈہ کرنے میں مہارت سے دوسرے دماغوں کو مسمرائز کر سکتا ہے جاگتے ہوئے بھی سلا سکتا ہے اور میں یہ کام بہت مہارت سے کر سکتا ہوں۔"

"تم انیس باقری کے بیٹے ہو کر....." وہ ایسے شاک میں آگیا تھا جیسے میں انیس باقری کا نہیں کسی بہت بڑے عالم کا بیٹا تھا اور ان کے قول و فعل کو سستے داموں بیچنے کا مرتکب ہو گیا تھا۔

"تمہیں میرے انیس باقری کے بیٹے ہونے پر دکھ ہے یا افسوس۔"

"دونوں..... مجھے دکھ بھی ہے افسوس بھی' مجھے حیرت ہے تم ان کے ساتھ ہر وقت رہے پھر بھی ان جیسے نہیں بن سکے اور میں جو کچھ لمحوں کی چوری کر کر کے ان کے پاس دوڑا آتا تھا ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کر کے ہیرا بن گیا۔"

"کیا واقعی پتھر کے اس دیس میں ہیرے کی کوئی وقعت ہے' لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور تم ہیرے کے قصے کہانیاں سناتے ہو۔" میں نے اسے طنز سے دیکھا اور پھر اس سے بھی برے لہجے میں کہا۔

"ہاں جب لوگ حلق تک بھر کے کھانا کھا سکتے ہوں' ریشمی گدوں پر سوتے ہوں' عالیشان گھروں میں رہتے ہوں' فرنشڈ گاڑیوں میں گھومتے ہوں تو جبران کی طرح وہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں ریشمی مخملیں گدوں اور زمین پر سونے والوں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"جبران مجھے بہت پسند ہے اس کی باتیں مجھے اس لیے اچھی لگتی تھیں کیونکہ وہ انکل انیس جیسی زبان میں مجھے سمجھاتا تھا۔"

"سمجھاتا تھا؟ اتنا مشکل اور ادق لہجہ..... صرف تم ہی سمجھ سکتے تھے۔" میرے منہ کا مزا کاک ٹیل کے مزے کے باوجود خراب ہو گیا میں پارٹی سے ایسے ہی اٹھ گیا۔

دراصل مجھے شہریار کے قصے سے وہ ساری باتیں یاد آگئی تھیں جو میں بہت مشکل سے بھولا تھا۔ گھر آیا تو میرا منہ دیکھ کر اماں کو ہول اٹھنے لگے۔

"کیا ہو گیا ہے بچے کیوں پریشان ہے؟"

"میں پریشان ہوں؟" میں نے آئینے میں خود کو دیکھا میرا چہرہ تو نارمل تھا مگر اماں میرے قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"آج تجھے پورے سات سال بعد اسی طرح پریشان دیکھ رہی ہوں جب تیرے بابا کو پہلی پہلی بار پتا چلا تھا کہ انہیں کینسر کی دیمک لگ گئی ہے اور تو ان سے چھپانے کے چکر میں ایسے ہی ہراساں ہوا پھرتا تھا مانو ہوا ہو' یہاں آیا وہاں گیا' وہاں آیا' یہاں بیٹھا ہی نہیں اور پھر چلنے لگا' چیزیں جو پہلے سے ترتیب سے تھیں انہیں ترتیب دینے لگتا۔" میں نے یکدم کرنٹ لگنے کی حالت میں اپنے ہاتھ روک لیے کیونکہ واقعی میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ترتیب چیزوں کو پھر سے دائیں سے بائیں کر رہا تھا۔

"بے ترتیبی اندر ہو تو باہر کی چیزوں کو جتنی مرضی آئے ترتیب دے لو دل کو تسلی نہیں ہوتی۔" میں نے چونک کر دیکھا سامنے اماں تھیں مگر بابا کا جملہ دوہرا رہی تھیں ہوتا ہے نا' آپ نے کبھی کوئی بات کسی اور سے سنی ہو پھر آپ وقت گزرنے پر وہ بات بھول جائیں مگر وقت یاد رکھتا ہے اور پھر وہی بات کوئی اور کسی اور ماحول' حوالے' زاویے سے آپ کی طرف کسی پرانی اینٹک چیز کی طرح بڑھا دیتا ہے' ایسی اینٹک چیز کی

...نے آپ سنبھال کر رکھ... میں نہ پھینک سکیں۔

"ہوا کیا ہے؟ آج سے پہلے میں نے تجھے اتنا بولایا ہوا نہیں دیکھا۔"

"اماں.... وہ شہریار.... شہریار سفیر ملا تھا مسٹر انور کی پارٹی میں۔"

"اچھا! کتنا بڑا ہو گیا ہو گا نا وہ؟" اماں اسے اپنے خیالات سے ناپنے لگی تھیں۔

"ہاں بہت بڑا' بہت ڈیشنگ بھی۔" میں نے تعریف کی اور پھر خود ہی بولا۔

"وہ ڈیشنگ نہیں ہو گا تو ہم ہوں گے' اماں یہ وزیروں' سفیروں کی اولادیں تو ہوتی ہی نری گلابی گلابی ہیں' نین نقش نہ بھی ہوں تو حلیہ' لباس اور گوری رنگت سب عیب چھپالیتی ہے گوری رنگت نہ ہو تو کریڈٹ کارڈ اور ہائی فائی وے آف لائف کافی ہو جاتا ہے۔" اماں نے کندھے پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"پتا نہیں کیا ملتا ہے تجھے اپنی بے سروپا باتوں اور سوچوں پر دل جلانے کے' ادھر دیکھ کوئی کمی رکھی ہے میرے اللہ نے تجھے دینے میں اچھی صورت تیز دماغ پورے ہاتھ پاؤں ایک بھی چیز کم دی ہے جو تو اوروں پر اللہ کی مہربانی دیکھ کر سڑتا ہے دیکھ حسد جلن یہ سارے اعمال بھسم کر دیتے ہیں۔"

"پلیز اماں یہ اعمال کے قصے مجھے نہ سنایا کرو مجھے نہیں جینا ان نری خوش فہمیوں میں کہ اوپر کوئی جنت ونت ملنی ہے مجھے اپنا پتا ہے جیسے اعمال ہیں میرے اس پر ایسی خوش فہمی پالنا سراسر بے وقوفی ہے۔"

"کیوں انیس کہتے تھے اولاد کو حلال کھلاؤ تو وہ بڑی پاک روح بن جاتی ہے پھر اس کے اعمال سے کوئی عیب سرزد نہیں ہوتا اور اگر بشری کمزوری کے تحت ہو جائے تو وہ اللہ ہے نا وہ کہتا ہے "جتنا بھٹکاتا ہے بھٹکا ابلیس مگر مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم جب تک میرا بندہ غلطی کرتا رہے گا مجھ سے معافی مانگتا رہے گا میں اسے معاف کرتا رہوں گا جتنی بار وہ مجھ سے معافی مانگے گا میں اتنی بار اسے معاف کرتا رہوں گا۔"

"پلیز اماں آپ نہیں جانتیں میرے بارے میں پلیز مت کریں اتنی اچھی باتیں' یہ کمال کی باتیں ہم بے کمالوں میں راندہ درگاہ لوگوں کے سامنے دوہرانے سے لفظ بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔" میں اٹھ گیا تھا۔

اس مشروب سے میری سانسیں بدبودار تھیں مگر وہ ماں تھیں پھر بھی جبر کر کے میرا ہاتھ تھامے مجھے سمجھا رہی تھیں اور اب میں اپنے واش روم کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ شہریار سفیر آج ہی کیوں ملا مجھے؟" مجھے غصہ آنے لگا میں نے فیس واش سے چہرہ دھویا تھا دانت برش کر کے مہنگے ترین ماؤتھ واش سے کلیاں کیں اور اپنے کمرے میں آ گیا کمرے میں روز کی طرح اماں گرم دودھ کا گلاس رکھ کر جانے کب آئی تھیں کب گئی تھیں پتا ہی نہیں چلا تھا میں بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

ابھی آنکھیں بند ہی کی تھیں جب اچانک بابا یکدم سامنے آ گئے تھے وہ باہر بیٹھے تھے اور کتنی آس اور امید سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے۔"

"کہہ رہے ہیں سب ٹھیک ہو جائے گا ٹریٹمنٹ جلدی شروع کرنی پڑے گی۔"

"یعنی کیا بیماری ہے مجھے۔" انہوں نے ایک دم سے میرے ہاتھ سے رپورٹس چھین لی تھیں پھر راز کب راز رہا تھا۔

"مجھے گھر جانا ہے نہیں رکنا یہاں...." بابا بضد ہو گئے تھے وہ ایک ریٹائرڈ آفیسر تھے اور سینئر سٹیزن کو پاکستان میں جتنی سہولیات میسر تھیں وہ اچھی طرح جانتے تھے اور وہ پہلا دن تھا جب میں نے اپنی زندگی کی پہلی چوری کی تھی۔

میں نے ایک جھوٹ لکھا تھا جس کے مجھے پورے پانچ ہزار ملے تھے پھر میں روز جھوٹ لکھنے لگا' بابا کا علاج اچھی طرح ہوتا رہا مگر میرے جھوٹ لکھنے اور ٹریٹمنٹ کے باوجود بابا صرف ایک سال اپنی زندگی کی لڑائی لڑ سکے تھے پھر جس دن ان کا جنازہ آیا اس دن ماں نے ایک خط مجھے دیا۔

"میں نے کہا تھا جب ایسا دن آئے تو یہ لفافہ میں تمہیں دوں پڑھ لو اسے۔" انہوں نے اتنی شدت سے کہا کہ میں دماغ قابو میں نہ ہونے کے باوجود پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔

پیارے بیٹے آدی

بہت پیار

میں جانتا ہوں تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو اتنا زیادہ کہ اس کے لیے تمہیں اپنی جنت بھی داؤ پر لگانی پڑی تو تم نے دریغ نہیں کیا' تم نے بیٹے ہونے کا حق نباہ دیا لیکن اللہ گواہ ہے میں نے بھی باپ کی حیثیت سے تمہارے لیے دنیا گنوادی ہے کبھی اپنے لیے نہیں سویا' کبھی اپنے لیے نہیں جاگا' کبھی نہیں تھک کے بیٹھا بھی تو اس لیے کہ تمہارے ننھے قدم میرے ساتھ چلتے چلتے تھک کر آرام چاہتے تھے' میں نے کبھی کوئی خواب اپنے لیے نہیں دیکھا ہر خواب تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہوتا تھا مگر آج جب میں اس آخری موڑ پر کھڑا ہوں تو ایک خود غرضی کرنا چاہتا ہوں' وہ یہ کہ تم میری تجہیز و تکفین میری حق حلال کی روزی سے کرنا' مجھے معلوم ہے تمہیں یہ پڑھ کر بہت دھکا لگے گا مگر میں چاہتا ہوں میں اس رب کے سامنے جاؤں تو اس کی دی نیکی بھلائی کی توفیق کے ساتھ جاؤں۔

مجھے اپنے اعمال پر کوئی گماں نہیں مگر اس کی مغفرت پر جی بھر کر یقین ہے۔

تمہارا باپ انیس باقری

میں نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں پتا نہیں مجھے کیوں لگا تھا بابا کا وہ خط کوئی گہرا تال تھا جس میں سے میں جب بھی نکلنے کی کوشش کرتا پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا۔

میں نے یکدم جھرجھری لی تھی اور ایک دم سے الماری کی طرف آ گیا تھا۔

میں نے لاکر کھولا تھا اور اس میں سے ایک نقشین صندوق باہر نکالا تھا۔

"یادیں؟ یہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں جو لوگ سب کچھ گنوا دیں آخری یاد کا آخری پر بھی جلا کر راکھ کر دیں تب بھی یہ دھواں جان نہیں چھوڑتا یادیں بے جان چیزوں میں ہوتی کہاں ہیں وہ تو لمس میں پنہاں ہوتی ہیں لفظوں میں' ان لہجوں میں قید ہوتی ہیں جو ہم پیچھے چھوڑ آتے ہیں مگر وہ لفظ' وہ لمس' وہ لہجے ہمیں نہیں چھوڑتے فانی چیزیں مٹ کر ختم بھی ہو جائیں تب بھی یادیں دل پر ہاتھ رکھے رکھتی ہیں کبھی ایک رگ دبا کر راگ چھیڑتی ہیں کبھی دوسری رگ پر ہاتھ رکھ کر اداسی بھری شام اچھال کر آنکھ لال کر دیتی ہیں۔"

میں نے صندوق کھول لیا تھا ایک تصویر تھی بہت ہی پیاری سی لڑکی تھی یہ۔

میرے ہونٹ ہنسے پر آنکھ میں جانے آنسو کیوں اٹک گیا آ کر۔

"دنیا میں مجھے تم سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں' تمہارے لیے دنیا چھوڑی جا سکتی ہے دنیا کے لیے تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"کیا واقعی...." میں نے تصویر میں کھڑی لڑکی کو اپنے سامنے بیٹھے پایا تھا تو پھر سے سوال زبان تک آ گیا تھا اور وہ لڑکی نقرئی قہقہہ لگا کر مجھ پر ہنس پڑی تھی۔

"تم ہنسی کیوں....؟" میں نے اس کے شہگی کٹ بالوں کو پکڑ کر کھینچا تھا اور وہ ہٹ دھرم بولی تھی۔

"اس لیے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے لوگ جس عادل انیس کے قلم کی کاٹ سے ڈرتے ہیں وہ میرے لفظوں سے کیسے جی اٹھتا ہے' مرتا ہے اسے ساری دنیا میں میری ہنسی' میری آنکھ کے گلابی پن سے فرق پڑتا ہے۔"

"زیادہ نہ فضول بولو بس ایویں بے چاری لڑکی سمجھ کر بات کر لیتا ہوں کہ میں بھی نہ بولوں تو تم تو خاموشی سے ہی مر جاؤ۔"

میں نے طرح دی اور اندر سے ڈر گیا کیونکہ وہ واقعی صحیح تجزیہ کر رہی تھی پتا نہیں مجھے اس کی عادت تھی یا اس کی محبت لیکن جب تک صبح میں آفس جا کر اس سے بات نہ کر لیتا مجھے لگتا میرے وقت کے کیلکولیشن میں ہلکا سا گھماؤ اور بے ترتیبی سی آ گئی

ہے اور یہ بری بات تھی کہ وہ میری یہ کمزوری سمجھنے لگی تھی اور مجھ جیسا زیرک صحافی جو دوسروں کی کمزوریوں پر طبع آزمائی کر کے کما کھا رہا تھا اس کے لیے یہ خطرناک تھا مجھے شریک سفر تو صرف اماں جیسی کم گو اپنے کام سے کام رکھنے والی چاہیے تھی مگر یہ لڑکی دماغ رکھتی تھی۔

"تمہیں خوش فہمیوں میں جینا اچھا لگتا ہے لگی رہو خرافات میں' مجھے ان باتوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے اور پھر انٹرسٹ ہو بھی کیوں تم میری لگتی کیا ہو۔"

"بتاؤں کیا لگتی ہوں....." اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں اور آج سات سال بعد بھی وہ اسی طرح مجھ پر حاوی تھی کہ میں آج بھی ان آنکھوں کے حق میں دائرہ در دائرہ قید تھا۔

"یہ قید کر لینے کا ہنر کیوں سیکھا تھا تم نے' کیا ملا مجھے گنوا کر۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی سے پوچھا اور وہ لڑکی بارش بن کر کن من کن من بھیگنے لگی بارش دوسروں کو بھگو دیتی ہے مگر وہ خود بارش ہو کر آپوں آپ بھیگ رہی تھی میں یکدم کھڑکی کھول کر ہوا سے اس برسی ہوئی خشک دھوپ میں جھلسی ہوئی بارش کا پتا پوچھنے لگا تھا مگر دوسری طرف مکمل چپ تھی۔

"تمہارے پاس کچھ نہیں ہے نہ فیم نہ ایم نہ کوئی ایمبیشن' تم مکمل طور پر تباہ ہو گئے ہو آدی۔" میں نے اس لڑکی کے پیچھے چپ چاپ اپنے اوپر روتی ہوئی جدائی کو دیکھا اور کراہا۔

"مت رلاؤ اسے___ پلیز مت رلاؤ اسے۔" اور وہ روکھے لہجے میں پکاری تھی۔

"مجھے تو وقت نے خود اتنا رلا دیا ہے میں کس کس کے آنسو پونچھوں' بہت محبت کی تھی آدی___ میں نے بہت محبت کی تھی پر اب میں کیا کروں تمہاری محبت آنسو کا نمکین سمندر بن گئی ہے سمندر کے کنارے کچھ نہیں اگتا نمکین پانی کسی کی پیاس نہیں بجھاتا آدی' کسی کی پیاس نہیں بجھاتا۔"

"میرا دل___ میرا دل اس محبت کی نہر کنارے کونپل کی طرح ابھرا تھا تم نے اسے سینچا تھا تم نے نظر سے اسے جلا بخشی تھی وہ میرا دل جو محبت کے بغیر سانس نہیں لے پاتا وہ تمہارے بغیر کیسے جی پائے گا۔"

"دفنا دو اسے' اس دل کو دفنا دو۔" وہ سفاکی سے بولی تھی پھر اس نے بہت رحم دلی سے میرا کندھا تھپکا تھا۔

"ہر فصل کے بعد اگر کسان امید کو آخری دانے کی طرح جھاڑ لے' تو وہ پھر دوبارہ فصل کے لیے بیج نہیں بو سکتا تمہیں بھی اس امید کو زندہ رکھنا چاہیے کہ کوئی اور تمہارے دل کی زمین پر آنے والے سمندر کے نمکین پانی کو اپنی محبت سے میٹھا کرے گا تمہارا دل جو پرانی محبت سے مر گیا ہے وہ گل سڑ کر پھر سے نیا احیا کرے گا' نئی کونپل پھوٹے گی تمہارے دل کے مدفن سے ایک نئی زندگی جینے کا حوصلہ سر اٹھائے گا۔

مگر آدی میں نہیں' وہ میں نہیں ہوں جو تمہارے لیے اتنا انتظار جھیلوں گی۔"

"شہرزاد___ پلیز شہرزاد میں بہت جلد خود کو سنبھال لوں گا ادھر دیکھو پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے' میرے اندر ایک خط پرانی یاد کی طرح پھڑپھڑاتا رہتا ہے میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو کوئی میرے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ دیتا ہے کسی کی بند آنکھیں مجھ میں پوری بینائی کے ساتھ بیٹھ کر رونے لگتی ہیں میں ایک لفظ نہیں لکھ پاتا مجھے پتا ہے میرے پاس نوکری نہیں ہے مجھے پتا ہے میرا گھر جو بابا کی وجہ سے میسر تھا وہ بھی نہیں ہے مگر میں بہت جلد پھر سے اپنا مقام بنا لوں گا' ادھر دیکھو وقت بھی تمہیں کہے گا کہ تم رک جاؤ اپنے آدی کے لیے رک جاؤ۔"

مگر وہ قدم رکے نہیں تھے میں نے کھڑکی سے پشت کر لی تھی اور کمرے میں نیلی لیمپ میں بیٹھے اس ہیولے کو دیکھا تھا۔

"تم چلی گئی ہو تو پھر پلٹ کر کیوں آتی ہو بار بار کیوں؟" میں اس ہیولے کے قریب آ گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں اسے جھنجوڑتا وہ ہیولا گم ہو گیا تھا میں نے اپنے سیلولر فون کو دیکھا وہ جل بجھ رہا تھا۔

"اتنی رات گئے کون؟" میں نے سوچا فون اٹینڈ کیا اور میری سانس میرے اندر کہیں گم ہو گئی تھی۔

"کیسے ہو آدی___ آج تم بہت اچھے لگ رہے تھے تم واقعی بات کے پکے ہو تم نے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر کے ہی چھوڑا' تمہیں پتا ہے سب سے زیادہ اس کامیابی پر مجھے خوشی ہوئی ہے آج۔"

میں طنز سے ہنس پڑا تھا آج وہ اپنے وڈیرہ شوہر کے ساتھ اس پارٹی میں اتنی ہی خوب صورت اتنی ہی دلکش لگ رہی تھی جتنی سات سال پہلے لگی تھی جب وہ میرے آفس میں کمپیوز سیکشن میں انٹرویو کے لیے آئی تھی یہ کام آفس کی طرف سے مجھے سونپا نہیں گیا تھا بس میں دل پشوری کے لیے یہ انٹرویو کر رہا تھا کیوں کہ اس جاب کے لیے باس کو پہلے سے امپرول سری آ چکی تھی مسٹر اینڈ مسز گروپ آف کمپنیز کی کوئی نور نظر تھی جسے یہ نوکری دیے جانے کے احکامات بہترین پیکج کے ساتھ باس کے ٹیبل پر تھے۔

ہمارا اخبار قطعی نیوٹرل نظر آنے کی کوشش کرتا تھا مگر در پردہ حکومت کو خوش رکھتا تھا اس لیے ہمیشہ پانچوں گھی میں رہتی تھیں مگر ہمارے باس مسٹر عباس مظہری انہیں "دل مانگے مور" کا فارمولا زیادہ سوٹ کرتا تھا خیر جب اس لڑکی نے میرے ریشہ خطمی سوالوں کے کرارے جواب دیے تو مجھے وہ ذرا ہٹ کر لگی کچھ الگ سی اور میں اس کی نوکری کے لیے کسی وائرس کی طرح باس کے سرکل میں جا بیٹھا۔

پھر ہر طرف سے جب اس لڑکی کی حمایت کا اعلان کیا جانے لگا تو تنگ آ کر اسے رکھ لیا گیا۔

"کیا سوچنے لگے' کہیں سات سال پیچھے تو نہیں چلے گئے دیکھو ماضی میں جانا تمہارے لیے خطرناک ہے تم حال کی طرف دیکھو اور بس' تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔ مجھے تمہاری کامیابی پر خوشی ہے۔"

"کیا تمہیں واقعی صرف کامیابی پر خوشی ہوتی ہے۔" میں نے لفظ جوڑے اور اگلا تیر چھوڑا۔

"کیا ہر کامیاب انسان واقعی خوش ہوتا ہے؟ کیا تم بھی بہت خوش ہو شہرزاد۔"

"ہاں میں بہت خوش ہوں کیا تمہیں نہیں لگا کہ میں خوش ہوں۔" وہ گڑبڑانے لگی تھی اور میں ہنس پڑا تھا۔

"انسان کی زندگی کا سب سے کنگال ہونے والا لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ دوسروں سے پوچھے کیا تمہیں نہیں لگتا میں خوش ہوں! شہرزاد پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے جیسے تم ماضی کی شہرزاد کی طرح بادشاہ کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچنے کے لیے روز ایک کہانی گھڑتی ہو اور روز سناتی ہو اسے بھی اور خود کو بھی اور پھر آئینے سے پوچھتی ہو۔ تمہیں نہیں لگتا میں بہت خوش ہوں۔

تمہیں پتا ہے شہرزاد ہر کامیاب انسان کی کامیابی اس کا رینک تو بڑھاتی ہے مگر اس کے کچھ بہت اچھے بے تکلف لمحے خود سے دور کر دیتی ہے وہ جولیس سیزر ہو' نپولین ہو' میں ہوں یا تم' ہم سب کے آنسو ہیں جو ہماری آنکھوں میں اٹکے ہوئے ہیں اور ہم جی کھول کر رو بھی نہیں سکتے کہ لوگ ہمیں دیکھ کر کہیں یہ نہ کہہ دیں کتنے کمزور کتنے ناشکرے لوگ ہیں اتنے کامیاب اتنی مزے دار زندگی جی رہے ہیں پھر بھی روتے ہیں۔" میں بولتے بولتے تھما تھا اور چونک پڑا تھا دوسری طرف رابطہ کب کا منقطع ہو چکا تھا اور میں خالی ریسیور سے بات کر رہا تھا اور فی زمانہ ہم سب خالی ہوا سے ہی تو باتیں کر رہے ہیں' کرتے رہتے ہیں' کبھی ہمارے دکھڑوں سے ہوا اوب جاتی ہے' کبھی ہم خود شرمندہ ہو کر چپ کی بکل ڈال دیتے ہیں خود پڑا اپنے دکھوں پر۔

میں نے صندوق میں تصویر واپس رکھی تھی اور وہ کامنی سے لڑکی یاد سمیت اس میں واپس قید ہو گئی تھی پھر میں صندوق بند کر رہا تھا کہ اچانک میری انگلیوں کے پوروں سے کچھ ٹکرایا میں نے ہاتھ سے اس شے کو باہر نکالا تھا یہ کانچ کے کنچے تھے۔

"ارے میں شہریار ہوں تجھے یاد ہے ہم کیسے کنچوں کا میچ جیتا کرتے تھے۔" مجھے ہنسی آ گئی یہ کنچے میں نے کس کے لیے سنبھال کر رکھے تھے آج کے زمانے میں کون کھیلتا ہے کنچے' آج کل تو بچے ہیلمٹ ٹائپ کے گیم پسند کرتے ہیں میں کنچوں کو ہوا میں اچھالتے اچھالتے تھم گیا میں نے اسے

صندوق میں واپس ڈال دیا۔
صبح میری حسبِ معمول دس بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی میں تھوڑی دیر کے لیے دفتر گیا تھا۔ لیکن تین گھنٹے بعد گھر لوٹا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔
"تمہیں میرا گھر کیسے ملا؟"
"جیسے کسی اپنے کو بہت اپنا مل جاتا ہے ڈھونڈے بغیر' اچانک آکر ٹکراتا ہے اور حق سے کہتا ہے میں ہوں نا جو دل میں ہے کہہ سن لو پوچھ لو ان کہی ان سنی نہ رہ جائے بعد میں نہ الزام دینا کہ حق دوستی نہ ادا کیا۔"
میرے دماغ کے آخری سرے تک یہ لفظ پھرے گھمن گھیریاں لینے لگے تھے یہ لفظ ہماری دوستی کے پہلے دن کی یادیں تھیں۔
"بنو گے میرے دوست۔" اس نے یکدم میرے سامنے ہاتھ پھیلا دیا تھا۔
"تم بھی تک مانگنے کی عادت نہیں گئی' چاہے دوستی ہو' لنچ ہو یا میری اماں کی محبت ابھی تک تیرا خیرات کھاتہ کھلا ہوا ہے۔" وہ ہنس پڑا تھا اور اماں مجھے سخت سست سنا رہی تھیں۔
"ارے لڑکے پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کوئی دوستوں اور گھر آئے دوستوں کو ایسے مخاطب کرتا ہے۔"
"اماں جب دوست کہتی ہیں تو پھر باقی کا گلہ جاتا رہتا ہے نا دوستوں میں بھی ناپ تول کے بولا جائے تو فائدہ دوستی کا' دوستی کا مطلب ہی ہائیڈ پارک کے ہے۔ جس کا جو دل چاہے بولے کہے اور آگے بڑھ جائے پھر ہم ذرا وکھرے ہیں بس آگے بڑھنے کے باوجود جو پیچھے رہ گیا اسے نہیں بھولتے۔" شہریار نے بڑی ملائمت سے کہا۔
"کیا رہ گیا تمہارا پیچھے۔" میں نے چڑے ہوئے انداز میں اسے دیکھا اور کہا اور وہ ـــــــ میرے پاس آن بیٹھا۔
"تم' اماں اور انیس سر' میرا کل اثاثہ' میں نے اس گھر سے بہت سیکھا ہے۔"
"کیا سیکھا ہے سوائے کنچے کھیلنے' چوری کرنے کے' میں نے کیا سکھایا ہے تمہیں ـــ اور بابا انہوں نے دنیا کو جو سکھایا اس کا صلہ میں دیکھ چکا ہوں ایک شخص بھی ان کے دکھ میں نہیں تڑپا' نہ رویا صرف میں اکیلا رویا ہوں۔
تمہیں پتا ہے میں اکیلا بیٹھ کر پوری دنیا کے دل کے برابر اپنے باپ کو تنہا رویا ہوں۔ کیا قصور تھا ان کا وہ ایمان دار تھے' وہ نرم خو تھے' وہ نیک تھے مگر پھر بھی کیا تم جانتے ہو انہیں اپنی بیماری کی اتنی تکلیف نہیں تھی جتنی اس بات کی تکلیف کہ ان کی واحد اولاد کرپٹ نکلی تھی میرے باپ نے تو مجھے انگلی پکڑ کر سیدھا چلنا سکھایا تھا مگر میں پھر بھی جگہ جگہ پورے قد سے گرتا رہا' مٹی میں' گارے میں' کیچڑ میں کہاں کہاں نہیں گرا میں۔" میری آواز تیز ہو گئی تھی پتا نہیں کیوں؟ اماں تیزی سے کچن سے باہر آگئی تھیں۔
"کیا ہو گیا ہے آدی' کیا ہوا؟" شہریار بھی ہراساں ہو گیا تھا۔
"میں چلا جاتا ہوں تم میری وجہ سے ڈسٹرب ہوتے ہو تو میں چلا جاتا ہوں یار۔" وہ یکدم کھڑا ہو گیا پھر میرے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوا تھا اور ایسا جب ہوتا اماں سامیہ کو بلا لیتی تھیں۔
اسامیہ میری کزن تھی شہزاد کے جانے کے بعد یہ لڑکی وہ واحد ذی روح تھی جسے میرے رونے سے دکھ ہوتا تھا میرے تڑپنے سے درد ہوتا تھا جو اماں کے ساتھ ساتھ میرے ارد گرد رہتی تھی اس کے ماں باپ نہیں تھے وہ میرے ماما' مامی کے ہاں رہتی تھی اماں کی بہن کی بیٹی تھی۔
"دو ایسے افراد جن کے دکھ مشترک ہوں انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیتے ہیں۔" ایک بار بابا نے کہا تھا اب مجھے شہزاد دنیا کی سب سے قیمتی انسان لگتی تھی مگر انسان کی قیمت کا فیصلہ وقت خود کرواتا ہے اور وقت نے ایسا ہی کیا تھا میں کمرہ بند کیے لیٹا تھا جب وہ آئی تھی۔
"آدی دروازہ کھولیں کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" میں نے آہستگی سے دروازہ کھول دیا تھا' ہرنی جیسی آنکھوں

میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔

"آپ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں آدی۔"

"مرا نہیں ہوں ٹھیک ہوں اور مر بھی جاؤں تو بھی کون ہے جو مجھے اس طرح روئے گا جس طرح میں بابا کو رویا تھا میں نے کیا ہی کیا ہے ایسا۔۔۔ جو کوئی میرے لیے تڑپے۔"

"آدی پلیز ایسا نہ کہیں کیا ہے ایسا برا آپ میں جو آپ کو کوئی دل سے نہ چاہے اور جنہیں دل سے چاہا جائے انہیں کوئی دنیا کی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

"دنیا کی قیمت۔۔۔" یکدم میرے اندر پرانے زمانے کی کیسٹ کی طرح دو ایک جیسے معنی دیتے لفظ گڈمڈ ہو گئے تھے شہرزاد اور بابا ایک ساتھ کھڑے تھے۔

"دنیا میں مجھے تم سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں تمہارے لیے دنیا چھوڑی جا سکتی دنیا کی قیمت پر تمہیں نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"لیکن اللہ گواہ ہے میں نے بھی باپ کی حیثیت سے تمہارے لیے اپنی دنیا گنوا دی۔" میں بیڈ پر بیٹھ گیا تھا سامیہ میرے قدموں میں بیٹھی تھی جیسے کچھ دیر پہلے شہریار بیٹھا تھا مجھے یکدم رونا آ گیا تھا۔

"جو جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اپنی زندگی میں کامیابی کے رینک تو لگا لیتا ہے لیکن اتنا ہی بے تکلف لمحات اپنی زندگی سے گنوا دیتا ہے۔"

میں نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا پھر دوسری صبح میں شہریار سفیر کے دفتر میں کھڑا تھا۔

"انسان جب کہیں سے چلتا ہے تو اکیلا ہی چلتا ہے مگر لوگ سے لوگ ملتے جاتے ہیں جب میں چلا تھا تو بالکل اکیلا تھا میری فیملی نے مجھے دو آپشن دیے تھے ایک یہ کہ میں ان کی زندگی جیوں ایک یہ کہ میں اپنی زندگی جیوں ان کی زندگی آسائشات سے بھرپور تھی دنیا میرے آگے سجدہ ریز ہو سکتی تھی اور دوسری زندگی تھی کہ میں ایک ایک ذرہ کو پہلے جمع کروں اسے گوندھوں اور پھر اسے چاک پر چڑھا کر کوئی شکل دوں ریت کے ذرات بھر بھرے بھی ہو سکتے تھے اور میرے حق میں بھی کہ چکنی مٹی کی طرح سمٹتے چلے جاتے

پہلے میں یقین تھا۔ دوسرے میں صرف ابہام تھا ایک رسک تھا مگر میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ایسے میں مجھے سر انیس کے چھوٹے چھوٹے جملے بڑی بڑی تبدیلی کے پاسز بن کر ملتے رہے میں نے بہت اعلا زندگی گزاری تھی میرے لیے کرائے کے گھر کے ایک کمرے میں پانچ پانچ افراد کا سونا بہت بھیانک خواب لگنا چاہیے تھا مگر مجھے ایسا نہیں لگا' میں نے محنت جاری رکھی میں نے صفر سے شروع کیا میری دولت یہ نہیں تھی کہ یہ صرف میرے لیے ہے میرے لیے دولت یہ تھی کہ اس میں ان کا بھی حصہ ہے جو میرے اس سفر میں کسی حوالے سے شریک نہیں لیکن اللہ نے حکم دیا کہ مجھے ان کے لیے کچھ کرنا ہے۔

مجھے ایسے میں سر انیس کا سنایا ہوا ایک واقعہ یاد آتا رہا اور ہمیشہ یاد رہے گا۔

"انہوں نے کہا تھا ایک بار حضرت موسیٰؑ اللہ سے ہمکلام ہونے جا رہے تھے تو ایک تنگ دست انسان نے انہیں روک کر کہا" اے اللہ کے نبی! جب آپ وہاں جائیں تو میری بھی عرضداشت پیش کیجیے گا کہ میرے حصے کا جتنا رزق ہے وہ اللہ ایک بار ہی مجھے دے دے تاکہ میں ایک دن ہی سہی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پیٹ بھر کر تو کھا سکوں آپ نے جا کر حسب وعدہ وہی عرضداشت پیش کی تو جواب آیا اے موسیٰ علیہ السلام' اس بندے کا رزق صرف ایک بوری اناج کے برابر ہے اس لیے اسے تنگ دستی کے ساتھ دیتا ہوں کہ ساری عمر اسے رزق ملتا رہے۔

آپ نے واپسی پر یہی جواب اس سائل کو دے دیا اس نے پلٹ کر کہا۔

"اے اللہ کے نبی! آپ کا جب دوبارہ جانا ہو تو اللہ کے سامنے دست بدستہ عرض فرمایئے گا کہ مجھے وہ ایک بوری رزق ایک دفعہ ہی عنایت کر دیں تاکہ میں پیٹ بھر کر کھا سکوں۔" آپ نے ایسا ہی کیا اور اگلی بار اللہ کی جانب سے اسے سارا رزق ایک بار ہی مل گیا پھر آپ کچھ عرصے بعد وہاں سے گزرے تو دیکھا وہ شخص بہت اچھے حال میں تھا اور اس کے گھر کے آگے دیگیں

چڑھی ہوئی تھیں آپ کو حیرت ہوئی آپ نے جا کر عرض کی۔

"اے باری تعالیٰ آپ کا کہا پتھر پر لکیر ہے مگر میں اتنے عرصے بعد گزرا ہوں مگر اس کا رزق تو ابھی تک جاری ہے بلکہ بہت اچھے طریقے سے اسے مل رہا ہے۔" اللہ نے فرمایا۔

"اے موسیٰ تم سچ کہتے ہو مگر وہ شخص بہت ذہین نکلا اس نے دیے گئے رزق سے خود بھی کھایا اور گھر والوں کو بھی پیٹ بھر کر کھلایا مگر جو رزق باقی بچا وہ اس نے میری راہ میں خیرات کر دیا اور یہ میں نے ہی وعدہ کیا ہے کوئی میری راہ میں ایک حصہ خرچ کرے تو میں اسے ستر حصے کر کے واپس کر دیتا ہوں اس نے مجھ سے تجارت کر لی ہے موسیٰ علیہ السلام اور میں اپنے وعدے کے مطابق اسے مسلسل لوٹا رہا ہوں۔" یکدم اب اس کی آواز کانفرنس روم سے آتا بند ہو گئی تھی۔

اور میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں لوگ کہتے ہیں نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے مگر آج مجھے لگ رہا تھا آپ کی کہی ہوئی کوئی بات کسی کو بدل دے' کسی کے ساتھ ساری زندگی کسی اچھے مخلص ساتھی کی طرح لپٹی رہے تو وہ بھی صدقہ جاریہ ہوتا ہے وہ بات آگے تک جاتی ہے پھیلتی ہے اتنی ہی زیادہ ہماری راہ کے کانٹے ہٹاتی جاتی ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جب وہ کانفرنس روم سے باہر آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی بلکہ بہت محبت سے گلے لگایا تھا۔

"تم نے کہا تھا تمہیں مانگنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی اور میں کہتا ہوں خیرات دینے والے تم جیسے ہوں تو میرے اندر ہاتھ پھیلانے کی عادت دم نہیں توڑ سکتی۔"

"شرمندہ مت کرو خیرات کرنے والے ہاتھ تو تمہارے ہیں تم میرے بابا کے لیے صدقہ جاریہ بنے ہو۔۔۔ میں کیا ہوں ایک عام سا منکر سا کرپٹ انسان جو اپنے باپ کو اپنی کمائی کا کفن تک نہیں دے سکا۔"

"غلطی کو مان لینا غلطی کے آدھے سدھر جانے کا نام ہے میرے ساتھ آؤ۔" وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا تھا اس کے آفس کے روم میں چھوٹی سی بالکونی تھی وہ مجھے اس کے سامنے لے گیا تھا۔

"یہ دیکھ رہے ہو یہ گلاب کا پودا میں جب اسٹرگل کے دنوں میں کئی بار لڑکھڑایا تھا تکلیفوں نے اکیلے پن سے بابا کی سیاست بھری دشواریوں کے پیدا ہونے سے' تو یہ پودا میرے اندر یقین بھر دیتا تھا میں جس کمرے میں تھا وہاں پلانٹ کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر میں نے کھڑکی کے سامنے اس کے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی تب مجھے لگا ہم چاہیں تو کسی کے لیے بھی اپنی زندگی میں تھوڑی سی جگہ بنا سکتے ہیں اگر ہم چاہیں۔

میں نے گلاب کے اس پودے کو پانی دیا اس سے باتیں کیں تو میرے اندر جو خاموشی جالے تان رہی تھی اس نے آہستہ آہستہ زور توڑنا شروع کیا تب مجھے دوسرا سبق ملا اگر آپ کسی کو توجہ اور محبت دیں تو لازمی طور پر دوسری طرف سے رد عمل آئے گا جو چیزیں

سانحہ ارتحال

گزشتہ دنوں ہماری پیاری مصنفہ فوزیہ یاسمین کے جواں سال بھائی فراز عالم صدیقی قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادارہ کرن اس دکھ کی گھڑی میں فوزیہ یاسمین کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فراز عالم صدیقی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ فوزیہ اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

بے جان ہوں وہ بھی رد عمل کری ایٹ کرتی ہیں اگر ایسا نہ ہو تو آپ کو اپنے کمرے کی تربیت میں معمولی سی تبدیلی کیوں کر ہانٹ کرے کیوں اچنبھا اور بے چینی بھر دے' پھر جب میں ہار رہا تھا اور نا امید سا تھا اسی گلاب کے پھول سے نئی کونپلوں نے سر ابھارا تب مجھے انتظار کرنا اچھا لگا تب میں نے سیکھا کہ کسی بھی نئی نوع کی تبدیلی اسی وقت آتی ہے جب ہم اپنے آپ کو فنا کر دیں' اپنا آج قربان کرنا آسان کام نہیں مگر پھر بھی اتنا بھی ناممکن نہیں کہ کیا ہی نہ جا سکے۔" میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا وہ کتنی سرعت اور کتنی خاموشی سے میرے اندر داخل ہو رہا تھا مجھے پتا تھا مگر میں نے اسے یہ حق خود بخود دے دیا تھا۔

پھر ہم ملنے لگے تھے اور آہستہ آہستہ وہ مجھے اپنی صورت میں ڈھالتا گیا' ایک دن اچانک اس نے مجھے ایک کرسی پر لا بٹھایا تھا۔

"یہ روزنامہ تم سنبھالو گے مجھے نہیں معلوم خبریں کیا ہوتی ہیں' خبر کے اندر خبر کیا ہوتی ہے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ تم اپنے کام کے بہت ماہر ہو۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے تھے پھر ملائمت سے بولا تھا۔

"تمہیں یاد ہے نا ہم کنچوں کے میچ کیسے جیتا کرتے تھے جب تم اور میں ایک ساتھ ٹیم بنا کر کھیلتے تھے دوسرے بچوں کی جیب کا آخری کنچہ تک ہم شرط میں جیت جایا کرتے تھے' رہی بے ایمانی تو کچی خبر تک جانے کے لیے جتنی کرنی ہے بے ایمانی کر سکتے ہو مگر جب خبر لفظوں کا روپ دھارے تو وہ ایک خالص سچ ہو۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ دوبارہ بولا تھا۔

"وہ جو ایک خط تھا تھوڑی سی بے ایمانی کی میں نے بنا اجازت پڑھا لیکن دیکھو اگر تم اسے غور سے پڑھو تو تمہیں لگے گا تمہارے بابا نے تمہاری محبت' تمہاری شدید محبت کو بہت محبت سے سراہا ہے تمہیں اسی محبت کو اپنا زادِ راہ بنانا چاہیے۔"

میں نے تڑپ سے اسے دیکھا پھر کراہا تھا۔

"بابا کو میری محبت پر جھوٹا زعم تھا کیونکہ اگر واقعی یہ سچ ہوتا کہ میں نے بابا کے لیے پہلی بار سچ کی چوری کی تھی تو ان کے بعد میں جھوٹ کا علم کیوں بند کرتا رہا؟ میں اندر سے ہی کرپٹ آدمی ہوں شہریار اور سمجھتا ہوں بہت پیار کرنے والا بیٹا ہوں بلکہ ہم میں سے ہر وہ شخص جو رشتوں کا آسرا لے کر کرپشن کرتا ہے وہ صرف اپنی ذات کی جنگ دوسروں کے کندھوں پر کھیلتا ہے وہ اپنے گند سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہے تاکہ جب وہ آئینے کے سامنے جائے تو وزن کے ساتھ کہہ سکے کہ اس نے جو کیا دوسروں کے لیے کیا اپنے لیے کچھ طمع نہیں رکھی۔"

اس نے پھر سے مجھے تھام لیا تھا پھر نرمی سے بولا تھا۔

"سامیہ بتاتی ہیں آپ نے ان سے محبت کی تبھی انکل انیس کی ڈیتھ کے بعد آپ نے لکھنا چھوڑ دیا تھا کوئی بات تو تھی نا ان سے محبت کی جو آپ نے لفظوں سے ناتا توڑ لیا۔" لحہ بھر تو وہ رکا اور پھر ملائمت سے بولا۔

"حالات دو طرح سے انسان کو آزماتے ہیں ایک کامیابی دے کر اور ایک کامیابی کے اندر ناکامی کا ہلکا سا احساس دے کر' کامیابی پوری اور مکمل ہو تو بہت کم لوگ اللہ کو جان پاتے ہیں لیکن اگر کامیابی بظاہر مکمل ہے لیکن اپنی ذات کا اطمینان نہیں ہے تو ایسی کامیابی نئے راستے کی طرف قدم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے نئے عقدے دریافت ہونے کے عمل سے گزریں تو تبھی پتا چلتا ہے سمت کتنی درست تھی بس یہ ٹھوکر ہے جو تم نے انیس انکل کے غم کے سامنے کھائی تم درست سمت کا تعین نہیں کر سکے مگر آدی۔ تم انسان ہو بشری کمزوریوں سے بھرا ہوا انسان' تم کوئی ولی نہیں ہو کہ کوئی گناہ نہ کرو نفس کو آنچ پر رکھنا آسان نہیں مگر مسلسل عمل جاری رہے تو نفس کسی حد تک قابو آجاتا ہے۔

اور جہاں بے قاعدگی آئے نفس میں' وہاں یہ یاد رکھو تم آدمی کی اولاد ہو وہ اولاد جس سے مالک کل نے وعدہ کیا ہے' وہ جتنی بار گناہ کرے گا اور مجھ سے معافی مانگے گا میں اتنی بار اسے معاف کروں گا۔" میں نے شہریار کو غور سے دیکھا تھا اس نے پہلی بار ملنے پر کہا تھا۔

"انیس سر نے مجھے پتھر سے ہیرا بنا دیا اور تم۔"

اور میں آج اسے دیکھ رہا تھا میں پتھر نہیں تھا شیشہ تھا تبھی تو ہر عمل جلدی جلدی میری ذات میں ری فلیکشن کرتا تھا۔

"ہیرے سے اگر آئینے کو کاٹا جائے تو۔" میں سیڑھیاں اترتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا اور وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"آئینے کے جتنے بھی ٹکڑے کرو وہ صرف وہی دکھاتا ہے جو سچ ہو' کیا تمہیں کبھی آئینے نے جھوٹ بولا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا تھا کیونکہ جھوٹ آئینے نہیں بولتے بس ہم سب کی آنکھیں اور اپنی مرضی ہے جو جھوٹ کا بگل وِل دیتی ہے ہمارے سچ پر اور ہم سب اچھا ہے سب اچھا ہے کا راگ گاتے گاتے ایک دن مر جاتے ہیں مگر خوشی کی تسکین کی بات یہ تھی کہ میں ابھی زندہ تھا اور توبہ کا دروازہ بھی بند نہیں کیا گیا تھا پھر میں دیر کیوں کرتا۔

میرے پاس سامیہ تھی شہریار تھا اور سب سے بڑھ کر میرے پاس اماں کی دعا تھی وہ دعا جس نے عمیق گڑھوں میں گرنے کے باوجود گم نہیں ہونے دیا تھا کوئی تھا جس نے محبت سے میری بانہہ پکڑ رکھی تھی اور مجھے اس پر آج بہت ناز تھا میں اور شہریار مغرب کی نماز پڑھ کر گھر آئے تو اماں ہم دونوں کی منتظر تھیں۔

"سامیہ سے کہہ کر تیرے لیے کوئی پیاری سی لڑکی ڈھونڈوا تا ہوں پھر دونوں ایک ساتھ شادی کریں گے کیوں ٹھیک ہے نا۔" میں نے مسجد سے نکلتے ہوئے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگا۔

"پورا اختیار ہے تجھے مجھ پر آدی۔" اور بس یہ کسی پر اختیار۔۔۔ پورا اختیار ہونے کی لذت ایک بہت خوبصورت چیز ہے۔

☆ ☆

یہ دل یہ سودائی

سعدیہ عزیز آفریدی

"اگر تمہیں لگتا ہے تم اس کے دل میں محبت کے ذریعے جگہ بنا پاؤ گی تو یہ غلط ہے۔" وہ بولتے بولتے مڑی اور عینا انور نے اسے غور سے دیکھا۔

"تمہیں یہ کیوں لگا کہ مجھے اس سے محبت جیسی خرافات محسوس ہوئی۔"

"بس مجھے محسوس ہوا تھا کہ عینا انور جسے کبھی کسی نے متاثر نہیں کیا تھا اسے ایک ایسے شخص نے متاثر کیا جو ہر چیز کو اہم سمجھتا ہے سوائے محبت کے۔"

"کوئی درد بھری لو اسٹوری۔" وہ طنز سے ہنسی اور ساحرہ احمد نے اسے کشن کھینچ مارا۔

"بھئی تو یہ دل والوں پہ ہنسنا چھوڑ دے' دیکھ کہیں تجھے یہ محبت زمین پر لٹا لٹا کر نہ مارے۔"

"محبت کی یہ مجال کہ وہ مجھے' عینا انور کو لیٹ ڈاؤن کرے۔" اس کے لہجے میں ذات کا غرور بول رہا تھا کاسنی گلابی سی رنگ برنگی مچھلی کی طرح چکیلی سی تھی بال بہت لمبے نہیں تھے مگر جب وہ اپنا جوڑا کھولتی تو بال کمر پر پھیلتے ہوئے گہرے بادل ہو جاتے' آنکھ میں شرارت اور ایسا سرور کہ بس دیکھو تو وہ ساحرہ کی طرح جوگی انسان من مرضی کے بغیر بھی مانتا چلا جائے۔

"تم آشم ہمدان کو کب سے جانتی ہو۔" اس نے سیب کا ٹکڑا منہ میں لیا۔

"ایک سال سے جانتی ہوں میں اور وہ ایکسپو سینٹر میں ملے تھے وہ وہاں اپنی کمپنی کی طرف سے پریزنٹیشن دے رہا تھا وہ مائکرو سوفٹ ویئر بنانے والی کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر ہے اچھی تنخواہ' عالیشان گھر قیمتی گاڑی' وہ ایسا ہے کہ لڑکیاں اس کے آگے پیچھے پھرتی ہیں مگر وہ یہی کہتا ہے محبت کے راگ کے علاوہ وہ سب باتیں کرتا' ایک لڑکی تو بہت حد تک اس کی چاہت میں گوڈے گوڈے ڈوب گئی مگر وہ ہاتھ نہیں آیا یہاں تک کہ اس نے اس کی اپنے ایک اچھے دوست سے بات طے کروادی پھر اس کی شادی کے بعد وہ میرے اسٹوڈیو آیا اور خوب ہنسا۔

"محبت... ہاہاہا سب کچھ ہے بس محبت نہیں ہے۔"

"اسے محبت سے چڑ کیا ہے...؟" عینا انور کو تجسس ہوا۔

اور پھر وہ ایک دم سے ان کی تھرڈ پرسن فرینڈ بن گئی ساحرہ احمد اور وہ باتیں کرتے رہتے اور وہ ان دونوں کی باتیں سنتی رہتی یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا اور اچانک اس نے کہا۔

"آشم کیا تم مجھ سے شادی کرو گے۔" ساحرہ احمد یکدم خفیف سی ہو گئی اسے لڑکیوں کی یہ بے باکی کبھی پسند نہیں تھی اور آج اس کی سب سے بیسٹ فرینڈ نے یہ کہا تھا تو وہ خوف زدہ ہو گئی تھی پتا نہیں انجام کیا نکلے۔

"تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو کیا محبت ہو گئی ہے اچانک تمہیں مجھ سے۔" اس کا وہی ہنسی اڑاتا لہجہ اور وہ اس سے بھی زیادہ دلکش لہجے میں ہنسی۔

"نہیں مجھے تمہارا زندگی گزارنے کا طریقہ پسند ہے تمہاری دولت مجھے کافی اٹریکٹ کرتی ہے۔" اس بار ہونق ہونے کی باری آشم ہمدان کی تھی۔

"تم واقعی سچ کہہ رہی ہو تمہیں میری دولت سے محبت ہے۔"

وہ پہلے سے زیادہ جذباتی لہجے میں [illegible] تھی۔

"تو آپ کو کیا لگتا ہے' ادھر دیکھیے یہ محبت' مجھے وہاں نہیں ملی جہاں یہ فطری اور قدرتی طور پر ہوتی ہے تو میں آپ جیسے اجنبی سے کیونکر محبت کروں گی۔ میری ماں نے دوسری شادی کرلی ہے میرا باپ اپنی دوسری بیوی کے بچے پالتے پالتے اب سینٹوریم میں ہے وہ شاعر نہیں ہے پھر بھی خون تھوک تھوک کر مر رہا ہے۔ میرے بھائی شادی کر کے الگ ہو گئے ہیں اور میں اپنی ایک الگ زندگی گزار رہی ہوں اپنا کھاتی کماتی ہوں اس لیے کسی کی دخل اندازی مجھے پسند نہیں۔" آشم ہمدان نے اسے دیکھا تھا اور ہامی بھرلی تھی۔

"مجھے تم جیسی لڑکی سے ہی شادی کرنی ہے جو محبت کا دم چھلا نہ لگائے میری زندگی میں' محبت کے بندھنوں میں باندھ کر مجھے گھر میں گھسیٹتی نہ پھرے ایک رنگ برنگی مسکراہٹ سے دھوکہ نہ دے کہ اسے

مجھ سے محبت ہے۔ تبھی وہ میرے اردگرد پھیرے لے رہی ہے۔ جو لوگ ایک بار محبت کے قائل ہیں مجھے ان سے بھی سو بار اختلاف ہے یہ محبت کہیں نہیں ہوتی یار۔"

"کیا واقعی یہ محبت کہیں نہیں ہوتی آثم۔" پہلی بار وہ ان دونوں کے درمیان عقل اور شعور کے بیچ تنے ہوئے دھاگے کی طرح مدھم انداز میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اب وہ دونوں اس کی طرف مڑ گئے تھے۔

"تمہیں کیسے لگتا ہے کہ دنیا میں محبت کہیں ہے۔" ساحرہ احمد نے کافی کے کپ کو تھام کے انہیں دیکھا تھا۔

"ہم تین الگ الگ لوگ اگر ایک ساتھ ہیں تو یہ کون سا جذبہ ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے یہ صرف ہماری اپنے اپنے اندر کی تنہائی ہے۔ جو بہت سارے لوگوں میں بھی غٹاغٹ محفلیں پی کر بھی پیاسی رہتی ہے۔ ہمارے اندر کی ادھاری ہوئی فرسٹریشن ہے جو اپنے جونیئرز، اپنی اولاد، اپنی بیوی اور اپنے باس کے پیٹھ پیچھے بیٹھ کر بولتے بولتے بھی نہیں تھکتی اور ایک نیا رشتہ بناتی ہے دوست! دنیا جہاں کا غم، غصہ جس پر انڈیل دو تو قفل لگے ہونٹ پلٹ کر کچھ نہیں بول سکتے، یہ مروت بھی عجیب کمینی سی چیز ہے آپ کو خواہ مخواہ اچھا بنے رہنے پر مجبور رکھتی ہے کہ چار لوگوں میں آپ کا نام چمکدار رہے۔" ساحرہ احمد نے افسوس سے آثم ہمدان کی تشریح سنی تھی اور یکدم اس نے اپنا بیگ اٹھالیا تھا۔

"پھر کب کر رہے ہو تم دونوں شادی۔"

"بہت جلد شاید اسی ماہ۔" آثم ہمدان نے حتمی لہجے میں کہا تھا پھر ان کی شادی ہوگئی تھی اور ساحرہ احمد شادی کے بعد اپنی دفتری مصروفیات کے باعث ان سے پھر نہ مل سکی وہ ہر بار پروگرام بناتے مگر مصروفیات جیت جاتی یہاں تک کہ تین طویل برس گزر گئے اور تب کہیں ساحرہ احمد کو فرصت ملی۔

ساحرہ احمد اس کے گھر گئی تھی، عینا انور جواب عینا آثم تھی بہت تپاک سے ملی تھی ساحرہ نے دیکھا اس کے گھر کی ہر چیز ایسی سنوری ہوئی تھی جیسے محبت نے خود اپنے ہاتھوں سے سجائی ہو خود عینا آثم کا پورا وجود بھی جیسے محبت کے رنگوں سے سجا ہوا تھا اس کے چہرے پر شفق گلابیاں گھلی ہوئی تھیں۔

"تم بہت بدل گئی ہو عینا۔"

"اچھی لگ رہی ہوں یا بری۔" اس نے چائے آگے بڑھائی اور ساحرہ احمد برملا بولی۔

"بہت الگ، بہت پیاری ہوگئی ہو۔ کیا تم دونوں نے محبت سے دوستی کرلی ہے۔" وہ ہنس پڑی اس کی ہنسی میں بھی محبت نے جلترنگ چھیڑ رکھا تھا۔

"آثم کو محبت سب سے بے کار شے لگتی ہے کیونکہ محبت کو انہوں نے کبھی بہت سچے جذبوں میں جھوٹے لفظ بولتے سنا تھا اور بہت اپنے رشتوں کو بے گانگی کا رنگ پہنتے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے انہیں بھی رنگ اور محبت سے چڑ ہے وہ کہتے ہیں دنیا میں کوئی رشتہ ہے جو کھرا ہے، پکا ہے، سچا ہے تو وہ صرف ضرورت کا رشتہ ہے۔"

ساحرہ احمد نے اسے غور سے دیکھا تھا پھر آہستگی سے بولی تھی۔

"ضرورت کے رشتے میں کبھی محبت خاموش وعدے کی طرح سامنے آئی تھی، کبھی کوئی گلہ کیا اس نے تم سے تمہارے دل کا۔" عینا کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"پتا نہیں میں نے واقعی ضرورت سے شادی کی تھی یا ضرورت کو آڑ بنا کر محبت کو پانے کی حسرت، میں نے کبھی محبت کو نہیں دیکھا تو سوچا تھا شاید اس طرح پالوں گی مگر آثم پر حالات نے اتنا سخت ردعمل کیا ہے ان کے دل کو اب بھی محبت کا راگ بے سرا لگتا ہے۔"

"کبھی تم نے سمجھایا اس کے دل کو، جذبات کے کسی کمزور لمحے میں بھی اس نے تم سے نہیں کہا مجھے تم سے محبت ہے عینا۔"

عینا نے حسرت [illegible] لی اور کوئی لفظ جواب تک نہیں پہنچا۔

"میں سمجھاؤں اسے۔" ساحرہ نے پیش کش کی۔

عینا آثم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ جو ایک معصوم سی عزت نفس ہے وہ گوارا نہیں کرے گی میں محبت بھیک کی طرح مانگوں آثم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے کہ تم لڑکیاں کہیں سے کہیں چلی جاؤ، کچھ بھی بن جاؤ، دنیا فتح کرلو تب بھی یہ محبت نام کا خانہ اور اس خانے کے اندر بھری ہوئی حسرت تمہارا منہ چڑاتی رہے گی پتا نہیں کیسی محبت چاہیے تمہیں یہ ناٹک بازی فلمی ڈائیلاگز والی محبت اب باکس آفس پر بھی پٹ گئی ہے اور تم اس طرح کی محبت کے لیے تڑپتی ہو۔"

"ہاں مگر یہ تمہارا حق ہے تم اس کی بیوی ہو۔"

"حق مہر میں ایک ہیرے کا سیٹ دیا تھا انہوں نے اور کہا تھا حق میں جب بھی دولت مانگوگی تو ملتی رہے گی محبت طلب کی تو یاد رکھنا تم نے دولت سے شادی کی تھی محبت کا ذکر کہیں نہیں آیا تھا۔"

"تو تم ساری عمر یوں ہی گزار دو گی۔ اس کی سیوا کرتے ہوئے اس کے بچے پالتے ہوئے۔"

"بچے۔" وہ حسرت سے اسے دیکھتی رہی۔

"آثم کہتے ہیں اولاد پیر کی زنجیر ہوتے ہیں سوچ کے دائرے کو وسیع نہیں ہونے دیتے، کولہو کے بیل کی طرح گول گول گھومتے رہنے پر مجبور کرنے والی بلا میں ہیں آج میں تنہا بیٹھتا ہوں تو سوچتا ہوں اگر میری ماں نے دوسری شادی کی تھی اور میرے باپ کو انگلینڈ کا ویزہ ملنے پر گھر کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اپنی زندگی سے نکالنا پڑا تو یہ کون سا غلط ہے میں نے سارا بچپن اپنے باپ کی خود غرضی پر روتے بلکتے جلتے کڑھتے گزارا مگر آج سوچتا ہوں اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا باپ آج بھی اس تیسرے ملک کا ایک غریب ترین آدمی ہوتا اسے میرے کمانے والے ہاتھوں کو تکتے رہنے کی اتنی عادت ہوتی کہ مجھے اپنی کمائی کو اس سے چھپانے کے لیے چور جگہیں تلاش کرنا مشکل ہوجاتا۔ ضرور کیا ہے جس کی بدولت مجھے ان کے بڑھاپے کو سہارا ضرور دینا چاہیے۔"

وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر بولی۔

"وہ کہتے ہیں اچھا ہے ابا اپنی زندگی میں مگن ہیں ورنہ انہیں کسی اولڈ ہاؤس میں داخل کروانا پڑتا اور لوگوں کی تھو تھو بھی برداشت کرنی پڑتی۔"

"تم نے نہیں بتایا بزرگ تو گھر کی برکت اور محبت کی سب سے بہترین مثال ہوتے ہیں۔"

"میں نے سوچا تھا کہوں۔ ایک بار شاید کہا بھی تھا تو وہ پلٹ کر غصے سے بولے تھے کون سی بہترین مثال، تمہارے ماں باپ کی یا میرے ماں باپ کی۔

ویسے دونوں کی غرض کا مقابلہ ہو تو شاید میرا باپ پھر بھی تمہارے باپ سے جیت جائے کیونکہ انہوں نے پھر بھی اپنی ذمہ داری پوری تو کی میری طرح تمہیں کسی یتیم خانے میں نہیں ڈالا۔"

ساحرہ احمد نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا تھا اور عینا اس کے قریب آگئی تھی۔

"مجھے ایک گھر چاہیے تھا ایک جیون ساتھی چاہیے تھا مگر میرا دل جانتا ہے اس میں کہیں بھی خود غرضی نہیں تھی میں دل سے کسی کے گھر میں بسنا چاہتی تھی میرے رب نے مجھے یہ انعام دیا بس محبت کی کمی ہے دیکھو شاید کسی مانگی جانے والی قبولیت کے لمحوں میں زندگی کو یہ دعا بھی لگ جائے اور میری زندگی مکمل ہوجائے۔"

ساحرہ احمد نے اسے گلے سے لگا کر پہلی بار دل سے محبت کی دعا دی تھی آج اس کے اندر کے ہر سوال نے جواب پالیا تھا کہ "بارش کے موسموں کو پسند کرنے والی، شاعری کو اوڑھنا بچھونا سمجھنے والی، کسی بھی دکھی محبت کی کہانی یا فلم پر بے ساختہ رو پڑنے والی لڑکی ایسے کیسے ہوسکتی ہے، کہ کہہ دے ہاں مجھے تمہاری دولت سے محبت ہے۔"

آثم ہمدان ہر ماہ اسے ایک اچھی خاصی رقم دیتا تھا خرچ کرنے کے لیے مگر ساحرہ احمد نے دیکھا تھا اس

ہاتھ میں بس شادی کا ڈائمنڈ رنگ تھا اور کسی بھی طرح کی فضول طرح داری کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی جب اس نے کشن کو گود میں لے کر کہا تھا۔

"ہم دونوں کو ایک نظم پسند تھی میرے اور آثم کے ساتھ اسی نظم کا ایک خاموش بندھن ہے پلیز ساحرہ اک بار پھر سے سناؤ تو۔"

ساحرہ احمد نے آنکھیں بند کی تھیں اور سنانے لگی تھی۔

سنو یہ موسم وصال کا ہے
سو اس کو یوں رائیگاں نہ جانو
اگر تم اذن سفر نہ دو گے
تو پھر یہ موسم
بہاررت میں بھی زرد پتوں کا بھیس بدلے
تمہارے آنگن سے آملے گا
اور آئینوں سے گلہ کرے گا

پھر یہ اس ملاقات کے دو ماہ بعد کی بات تھی جب آثم ہمدان بالکل زرد چہرے کے ساتھ اس کے سامنے آیا تھا۔

"محبت خرافات ہے نا عینا۔" عینا نے اس کے سرد ہاتھ تھام کے ہاں میں سر ہلایا تھا اور وہ پھر کرلایا تھا۔

"زندگی میں کوئی بھی رشتہ ضرورت کے رشتے سے زیادہ پائیدار اور مضبوط نہیں ہوتا۔"

"ہاں آثم مجھے ایمان ہے اس بات پر۔"

"عینا جو لوگ خود غرض ہوں ان کے سامنے آنکھوں میں اتنی ہی بے مروتی بھر کر دیکھنا جائز ہے نا۔" آثم ہمدان نے لگا اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"اولڈ ہوم بوڑھے لوگوں کے لیے ہوتے ہیں نا پھر میری جوانی کو پیرانہ سالی سے کیا لگاؤ...؟"

"ہوا کیا ہے آثم..." عینا حیران تھی۔

"باہر... باہر کوئی بیٹھا ہے کوئی تھکا ہوا مسافر جسے گھر یاد آیا ہے جسے میں یاد آیا ہوں پتا نہیں کیسے انہیں یتیم خانہ یاد آیا ہے دو ہفتے سے وہ دھکے کھاتے پھر رہے ہیں میرے پرانے دفتروں کی خاک چھانتے ہوئے

دوستوں سے ملتے ہوئے وہ لوٹے ہیں عینا میرا دل... میرا دل انہیں دھتکار نہیں پا رہا ہے۔

میں نے چاہا میں ان کا ہاتھ جھٹک دوں مگر پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا۔

محبت یہ خرافات ہے مگر شاید اسے میرے دل سے دشمنی نکالنے کا کوئی اور راستہ نہیں ملا میں... میں نہیں مانتا اس محبت کو۔" عینا نے اسے گلاس بھر کر پانی پلایا۔

"میں انہیں اندر لے آؤں..." اس نے اجازت چاہی۔

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے کسی سپہ سالار کو جو جنگ جیتنے ہی والا تھا اچانک بادشاہ نے ہتھیار پھینک دینے کا حکم سنا دیا ہو۔

عینا بہت بیمار بہت لاغر سے ہمدان راحت کو اندر سہارا دے کر لائی تھی۔ اس نے ان کا کمرہ سیٹ کر دیا تھا۔

اور آثم ہمدان کے روز و شب ناراضی میں لپٹے ہوئے مگر ساری توجہ سے بھرے ہوئے ہمدان راحت کے گرد گھومنے لگے تھے پھر ان کی طبیعت خراب ہوئی تو ٹیسٹ کے بعد پتا چلا کہ وہ کافی بیمار ہیں اسی لیے ماضی کی بات چیت دوہرانے کے لیے لوٹے تھے۔

آثم ہمدان ان کے قریب جانے لگا تھا وہ آثم کے بچپن کی شرارتوں اور باتوں سے اس کے اندر سوئے ہوئے بچے کو جگا رہے تھے وہ نامحسوس طور پر بدل بھی رہا تھا مگر پھر وہ یکدم ہٹ پر جم گیا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں جب چاہیں گے میری زندگی کو اپنی مرضی سے چلائیں گے آپ کی زندگی نے چاہا میں غیر ضروری ہوں آپ نے مجھے یتیم خانے کی تنہائی کے حوالے کر دیا اب آپ کو لگا کہ میرے ماضی میں چھپے والے کچھ پل ہیں جن سے میں خود بھی واقف نہیں ہوں جینے کے لیے میرے وجود کی ضرورت ہے تو آپ کی ضرورت اپنی زندگی میں مجھے گھسیٹ لائی ہے کیا وہاں اچھے اسپتال نہیں ہیں یا اولڈ ہوم نہیں ہیں۔"

عینا کی آنکھ...

گئی تھیں مگر یہ ایک اولاد کا اپنے باپ سے اپنے بچپن کا دکھ تھا وہ چپ رہی تھی اور ہمدان راحت نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔

"وہاں میرا گھر بھی ہے اولاد بھی ہے اچھے اسپتال بھی ہیں اور اولڈ ہوم بھی میں اولڈ ہوم میں ہی تھا مگر مجھے لگا میرے اندر جو ایک جٹ کا خون ہے وہ ایسے سرد سے کمرے میں ٹھٹھرتی ہوئی تنہائی میں مرنے سے خوش نہیں ہو گا۔ دیکھ ادھر دیکھ بڑا اونچا گھبرو جوان ہے، جانتا ہوں بڑا غصہ بھرا ہے تیرے دل میں میرے لیے، پر بے فکر رہ اپنی کسی غلطی پر کوئی دلیل نہیں دوں گا کسی جھوٹی مجبوری سے اپنے لیے معافی کی راہ نہیں نکالوں گا۔ سچ ہے یار اس وقت جوانی کا جوش تھا اور بس اپنے دل کی مراد جیسے جینے کی لگن بیوی چھوڑ گئی تھی پھر بچے کو کیا پتا یہی سوچا بچے خود پل جاتے ہیں مگر جب راستے تھکے، وقت رکا تو مرے دل میں ہوک ہوئی پتا نہیں تو کیسا ہو گا۔ کتنا بڑا، کتنا جوان، کوئی بڑا آفیسر یا کوئی جیب تراش، میں اکثر جیبیں ٹٹولتا رہتا آفندی کہتا ڈیڈ جیب میں کیا تلاش کرتے ہیں، پر میں چپ رہتا کیا بتاتا اسے کہ میرا ایک بچہ کھو گیا ہے کسی نے نہیں خود میں نے گنوا دیا ہے اسے، پر شاید میں یہ بتا نہیں سکتا تھا پر سچ تو ہے یہاں جب میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا تو میری کتنی بار جیب تراشی ظالموں نے، میں نے کہا کوئی نہیں ایک بار تو مل جائے سب سو کھا ہو گا۔

دیکھ میں تیری خدمت لینے نہیں آیا نہ ہی تیری توجہ چاہیے پر دل چاہتا ہے جب میں مروں تو کوئی تو ہو جو دل سے روئے مجھے 'قدر وہی کرتا ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے اور تیرے پاس بھی جھگڑے کے لیے میرے سوا کون ہے اور بڑے کہہ گئے ہیں لڑائی جھگڑے محبت کی علامت ہوتے ہیں۔" وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور باہر نکلتا چلا گیا عینا گھبرائی تو وہ ہنس کر بولے۔

"میری طرح جوشیلا ہے پر اس کے ساتھ تو ہے نا، نہیں جاتا میں...

عینا پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی، پھر رمضان شروع ہو گئے وہ بیماری کے باوجود روزے رکھ رہے تھے اور وہ گھبرا کے عینا سے کہتا تھا۔

"تم منع کرو بابا کو وہ... نہیں سکیں گے تم تو ان کی کنڈیشن جانتی ہو نا۔"

پھر پندرہویں روزے کو ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور اس نے پہلی بار محبت کے لیے وضو کیا تھا شام تک ان کی آکسیجن ہٹ گئی ہے وہ ان کے سامنے اس وقت بھی اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔

"عینا بیٹا افطاری کا بندوبست کیا میرے شہزادے کے لیے۔" اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"مجھے ایسی باتوں کی عادت نہیں۔"

"تو میں نے بھی کبھی ایسے فلمی ڈائیلاگ نہیں

بولے پر اب بول رہا ہوں نا۔ تو بھی کچھ عادتیں بدل لے ورنہ بچے نہیں گے عہنا سے ایسا ابا کمال سے لیا۔" عہنا منہ چھپا کر ہنسی چھپانے لگی اور وہ غور کے بولا۔

"زیادہ نہ بولیں سانس دم ہے نہیں اور ڈائیلاگ مارتے ہیں لمبے لمبے۔"

"باپ کس کا ہوں یار۔" انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس نے پہلی بار ہاتھ کو نہیں جھٹکا۔

"پتا ہے بڑی منت گریہ زاری کی ہے تو نے' زبردستی واپس مانگا ہے مجھے' دیکھ اب جھوٹ نہ بولنا' دیکھ شکر کر زندگی نے تجھے محبت مانگنے کے لیے دی لوٹانے کے لیے محبت نہیں بخشی ادھر دیکھ' میں نے زندگی میں کسی سے سچی محبت کی تو وہ میری ماں تھی اس نے دنیا سے ہر دکھ سے مجھے ایسے بچایا جیسے مرغی اپنے پروں میں چوزوں کو چھپالیتی ہے پر مجھے کبھی اس کے جتنی بلکہ جتنی اسے تھی مجھ سے اس کے آدھوں آدھ محبت بھی نہیں تھا پر سمجھتا تھا مجھے بڑی کمال محبت ہے پر جب میری ماں بیمار پڑی اور میں نے اسے تیری طرح بڑی منت مرادوں سے مانگا تو ماں کے کمزور چہرے پر پھیکی مسکراہٹ آئی' کیوں بلاتا ہے مجھے تجھے نہیں پتا کتنا درد ہے میری جند جان میں' مت بلایا کر بار' بار اب کہہ دے میری مشکل آسان کرے میرا مولا' میں اتنی محبت کرتی ہوں تجھ سے میرے لیے اتنا نہیں کر سکتا۔

اور آثم اس دن مجھے پتا چلا یہ محبت جھلی یہ میرے لیے بڑی اوکھی بڑی تکلیف دہ ہے اس دن ماں کی محبت نے مجھ سے کیا دعا کروائی میں نے کیا مانگا کیسے مانگا مجھے نہیں پتا پر صبح تک ماں نے آنکھیں بند کرلی تھیں میری ماں کی سچی محبت نے مجھے زندگی دی پر میری محبت کی سچائی نے اسے موت کا تحفہ دیا اس لیے محبت جیسے چاہے چلنا چاہیے اپنی مرضی کرو تو پھر یہ لٹا لٹا کر مارتی ہے مار مار کے ملا بتاتی ہے محبت سمجھ آئے تو آپ ورنہ کوئی نہیں بتا سکتا محبت کرنے کا ہنر' بڑی سخت استانی ہے پہلے سبق دیتی ہے پھر امتحان لیتی ہے۔

پر ہٹ دھرمی دکھاؤ مرضی کرو تو پہلے امتحان لیتی ہے پھر سبق دیتی ہے' چاہے پھر اس سبق کو رٹتے رٹتے لکیر کو پیٹتے پیٹتے عمر گنوا دو یہ پلٹ کر نہیں دیکھتی۔

بابا سانس لینے کو رکے تھے اور اس نے انہیں رکنے کو کہا تھا آرام کرنے کو کہا تھا۔ پر وہ پھر بولے تھے۔

"مجھے پتا ہے تیرا بچپن ابھی تجھی ماضی کی کسی پینچ پر سزا میں کھڑا ہے تو اس کی ہچکیوں سسکیوں سے تھک گیا ہے تو اسے پیار کرنا چاہتا ہے' منانا چاہتا ہے پر تیرے اندر کا غصہ وہ روک بنا ہوا ہے اس کے اور تیرے بیچ۔

ادھر دیکھ یہ ضرورت کا رشتہ کیا ہوتا ہے تجھے پتا ہے کوئی پھل دار درخت ہوتا ہے اس کو نوچتے کھسوٹتے ہیں بچے سب پھل توڑ لیتے ہیں انہیں ضرورت اور ذائقہ کا فرق بھی نہیں آتا جہاں ضرورت ختم ہوتی ہے ذائقہ بھی ختم ہو جاتا ہے مگر کوئی جذبہ انہیں اس درخت تک بار بار لاتا ہے کیا یہ بے جان درخت سے محبت انہیں کھینچ لاتی ہے نہیں' یہ درخت کی قدرت سے محبت' اسے اتنا مان بھرم کہ وہ کچھ دے سکتا ہے اس کا فخر ہے جو چپ چاپ بچوں کو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے' ضرورت کچھ بھی نہیں ہے آثم بیٹے کا حوصلہ محبت کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور محبت ایک بار متوجہ ہو جائے تو انسان ولی بن جاتا ہے۔" تو ولی تو نہیں بن سکتا کیونکہ میرا پتر ہے پھر انسان تو بن ہی سکتا ہے۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوتے پھر سے مذاق کرنے تو اس نے نروٹھے پن سے انہیں دیکھ کر چپ کی چادر اپنے اور ان کے بیچ تانے رکھی۔

"درخت کا پھل ضرورت ہے مگر پھل کے بغیر بھی اگر کوئی درخت کو توجہ دیتا ہے تو یہ اس درخت کا جھکاؤ' اس درخت کا گھنا پن' اس کا سایہ ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے' کبھی تو نے ضرورت سے پاس بیٹھنے والوں کو اتنا مطمئن' اتنا سکھی دیکھا ہے جتنا تیری ماں سکھی ہے کیا کوئی ضرورت کسی کو ایک دوسرے سے اتنے عرصے تک اور اتنے سبھاؤ سے باندھے رکھ سکتی ہے کیا عہنا تیری آنکھ سے تیرے من کا بھید بھاؤ نہیں جانچ لیتی کیا اسے تجھے کبھی بتانا پڑا کہ تیرا کیا من کر رہا ہے۔" عہنا کمرے سے نکل گئی تھی اس بھید بھرے سوال سے ایک اور سچ بھی تو برآمد ہوا تھا وہ بظاہر بہت چپ تھا مگر آج وہ اس بات کا اعتراف کر سکتی تھی کہ۔

"اس کے جیون ساتھی نے کبھی اسے ضرورت کی طرح نہیں برتا کیا کوئی محبت کے جذبے کے علاوہ بھی اتنے پیار سے اتنی محبت سے رشتہ نبھاتا ہے۔" ایک کھوئی ہوئی مسکراہٹ تھی جو کسی تنگ گلی میں کھو گئی تھی اور آج دوڑ کر اس کے ہونٹوں سے آکر لپٹ گئی تھی آثم ہمدان باہر آیا تھا۔

چپ تھا مگر اس کی آنکھ اس کا سارا وجود عہنا سے ہم کلام تھا۔

"جب تم محبت سے ملو تو یہ مت کہو وہ تمہارے دل میں ہے بلکہ کہو تم اس کے دل میں ہو۔" اور آج اتنے برسوں بعد جبران کے یہ لفظ نیا راستہ بنا رہے تھے ہمدان راحت کی خواہش کے مطابق اس بار عید واقعی چھٹی ہو گئی تھی آثم ہمدان نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں نہیں چرائی تھیں بلکہ ایک دوسرے کی مسکراہٹ سے سج گئے تھے۔

"میں افطاری کا سامان لائی تھی۔" ساحرہ احمد کی آواز ایک اچھے دوست کی طرح زندگی میں گونجی تھی۔

"دوست زندگی کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں۔" آثم ہمدان کا دل پہلی بار محبت کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو رہا تھا۔ وہ تینوں کوریڈور میں ایک سائڈ پر کپڑا بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔

"مجھے معلوم ہے تمہاری شادی صرف محبت کی تھی میں بس یونہی چل پڑا تھا مگر کبھی کبھی چڑ جاتا تھا جب تمہیں چپکے چپکے اپنے باپ کی خدمت کرتے دیکھتا انہوں نے شاید ہوش میں تمہیں کبھی نہیں دیکھا مگر مجھے تمہاری خاموش قسم کی غیر موجودگی کھلتی تھی مجھ کو ام [illegible] ہے تمہاری چیک بک سے ابھی تک ایک چیک بھی نہیں کاٹا گیا تم محبت میں سادھو ہو دنیا کا کوئی لالچ نہیں بس محبت کرنی ہے۔ سچ بتاؤ کیا ان سب باتوں کے جاننے کے باوجود مجھ سے محبت کرو گی۔"

عہنا آثم نے اذان کی آواز سن کر مجبور منہ میں رکھی تھی دعا مانگی تھی اور قبولیت دعا سامنے بیٹھا تھا وہ اس کے ہاتھ پر محبت سے ہاتھ رکھتی بابا کا سوپ لے کر ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی تب اس نے ساحرہ احمد کی طرف دیکھ کر بہت دل سے کہا تھا۔

"میرے بابا بہت اچھے انسان ہے یار بشری کمزوریاں تو سب میں ہوتی ہے پر یہ سچ ہے انہوں نے آکر ہی مجھے محبت ضرورت کا فرق سمجھایا ہے ساحرہ احمد تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ اتنے عرصے سے میری دوستی کو نبھاتی رہی ہو۔" ساحرہ احمد ہنس پڑی تھی اور پھر سے وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"دوست انسان کے لیے زندگی کی طرف کھلنے والے تازہ ہوا کے دریچے ہوتے ہیں ان دریچوں پر کبھی جالے مت تننے دینا آثم۔" ساحرہ احمد نے خاموش عہد کیا تھا اور وہ بھی کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ عہنا' ہمدان راحت کو سوپ پلا رہی تھی۔

"ہاں اور پھر روئے گا نا میرے مرنے پر' دھوم دھڑکے سے جنازہ نکالنا ہے نا میرا۔"

"بابا ایسے تو نہ کہیں۔" وہ پہلی بار ان کا ہاتھ چوم کر آنکھیں بھینچنے کے لمحے سے لطف لینے لگا محبت کی اس بخشش پر وہ مطمئن تھا اور ہمدان راحت بھی مسکرا رہے تھے اور زندگی تو ان سے بھی زیادہ کھل اٹھی تھی اور یہی موسم' موسم وصال کا تھا۔

☼ ☼

سعدیہ عزیز آفریدی

وہ میرا دوست نہیں تھا بس جان پہچان والا ایک حوالہ تھا جس سے راہ چلتے کبھی کبھی ہیلو ہائے ہو ہی جاتی ہے۔ میں ایسے رشتوں سے ہمیشہ گھبراتا ہوں' جو خوا مخواہ مہمان بن کر آپ کے سر ہو جائیں' ہمیں اپنا مانو ورنہ کرتے ہیں خود کشی۔ ضمیر ایسا ہی شخص تھا جو مری جان کو آ گیا تھا۔ دفتر میں ہم دونوں ہی کلرک تھے مگر میری اوپر کی آمدن میری تنخواہ کا حساب بے باق کر دیا کرتی تھی' یہی وجہ تھی جو ضمیر کو مجھ سے جوڑے رکھتی۔ ادھار کے لیے ہمیشہ اس کا ہاتھ مرے سامنے دراز رہتا اور کسی کو خیرات کی طرح ادھار دینے کی لذت کا جو کمینہ پن ہے' اس کا مزہ میں اپنی بیوی عالیہ کے ہزار بار کے جھگڑوں اور منتوں کے باوجود کھونا نہیں چاہتا تھا مگر اس دن تو حد ہی ہو گئی۔ میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ لنچ کا پروگرام بنا بیٹھا اور مروتاً" اس سے بھی پوچھ لیا۔

"تم بھی چلو گے کیا؟"

اس کی باچھیں کھل گئیں۔ آج سے پہلے کہاں اسے کسی اچھے اور مہنگے ہوٹل کا کھانا نصیب ہوا تھا۔ باقی دو دوست تو اپنا خرچا خود کرنے والے تھے مگر مجھے مروت دکھانے کے لیے پورا حق دوستی نبھانا تھا' وہ دونوں میری حالت پر ہنس رہے تھے اور مجھے ضمیر پر غصہ آ رہا تھا' یہاں تک کہ ہم لنچ کے لیے کاشف کی گاڑی پر ہوٹل پہنچے۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی ہی تھی کہ ضمیر کے وجود نے بدن توڑنا شروع کیا۔

کاشف کسمسایا "مینوز ضمیر! دربان خود دروازہ کھولے گا۔"

وہ پزل ہو گیا پھر ہم باہر نکلے۔ کاشف نے کار کی چابی اسے دی۔ اس نے اسلام علیکم کہا اور ضمیر پورے سلام کا جواب دینے بیٹھ گیا' میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"یہ بھی ایک ہی فلم ہے۔ دیکھ لینا اس کے بیوی بچوں کی خیریت لے کر ہی آئے گا۔" میں منہ دبا کر ہنسنے لگا تھا۔ ضمیر بہت خوش آیا تھا۔

"بہت اچھا انسان ہے بہت عزت سے بات کی۔"

میرے منہ میں کھجلی ہوئی کہ پوچھوں' پہلی بار کب کسی نے تم سے عزت سے بات کی تھی کچھ یاد ہے۔ کیونکہ جو باتیں ہماری زندگی میں کم کم ہوں' وہ ہی اچھی لگتی ہیں جیسے بیوی کی شاپنگ' بچے اور ضمیر جیسے لوگوں کے لیے عزت سے مخاطب کیا جانا۔

ضمیر ہوٹل کی آرائش کو بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ ٹیبل پر رکھے آرائشی چمچوں اور کانٹوں کو وہ بار بار چھو کر دیکھتا۔

"کافی مہنگے لگتے ہیں۔"

"ہوں...." کاشف نے آہستگی سے جواب دیا۔

پھر مینیو کارڈ پر قیمت دیکھ کر ہی اس کی روح فنا ہونے لگی "یہ چائے سو روپے کی۔ آخر ایسا کیا خاص ہے اس چائے میں دودھ انگلینڈ سے آتا ہے کہ پتی سونے کے مول ملتی ہے۔"

"آج کل تو چینی سونے کے مول مل رہی ہے۔" کاشف نے جان کر اس کی رگِ غربت کے ساتھ چھیڑ

چھاڑ کی اور وہ موجودہ حالات اور حکمرانوں پر پیپر پڑھنے لگا۔ حفیظ نے مشکل سے اسے مینیو کی طرف واپس پلٹایا پھر اس نے اپنے تئیں سب سے کم قیمت ڈش کو ٹک مارک کیا تھا۔ وہ ڈش ٹک مارک کر کے واش روم کے لیے چلا گیا تھا اور کاشف نے اس کے جاتے ہی اس کے بجائے میرے لتے لیے تھے۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی اسے آفر کرنے کی۔ آنکھیں دیکھی ہیں۔ کتنی غریب ہیں اس کی' حلیہ تک تو ٹھیک نہیں ہے اس کا اس کی رگ رگ میں غربت بھری ہوئی ہے۔ غربت سمجھتے ہو ناں' یہ معاشی الٹ پھیر نہیں بس دلی طور پر کنگال ہونے کی نشانی ہے ورنہ ہم نے بھی تو غربت میں آنکھ کھولی ہے مگر ہمارے اندر ایسی کوئی کمی نہیں ہے۔ انسان کی آنکھ سیراب ہونی چاہیے یہ کیا کہ غربت بندے کی آنکھوں سے جھانکتی' حلیے سے ٹپکتی نظر آئے۔"

میں نے جوتے کی ٹو سے کاشف کو اشارہ دیا تھا کیونکہ وہ اس کی پشت کی طرف سے خراماں خراماں واپس آ رہا تھا۔ کھانا دوستانہ ماحول میں کھایا گیا تھا مگر اس نے تھوڑا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

"کیوں کیا ہوا' تمہیں کھانا پسند نہیں آیا؟"

"نہیں کھانا بہت اچھا ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا جمیلہ اور بچوں کے لیے لیتا جاؤں۔"

کاشف نے مجھے گھور کے دیکھا تھا مگر میں جب تک بات سنبھالتا' وہ کھانے کو پیک کروانے کا آرڈر دے چکا تھا۔ ہم تینوں ہاتھ دھونے واش روم گئے تھے اور کاشف تلملایا ہوا تھا۔

"بہت ہی گری ہوئی حرکت کی ہے اس نے۔ پورا کا پورا غربت کا اشتہار ہے یہ چلتا پھرتا۔ آئندہ بھی تو نے اسے ایسی کوئی آفر کی ناں تو ہم دونوں تیرا گلا گھونٹ دیں گے۔"

میں نے بمشکل انہیں ٹھنڈا کیا تھا۔ ہم ہوٹل سے باہر آئے تھے کہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے ایک گداگر بچے نے شیشہ ناک کیا تھا۔

"دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ اللہ کے نام پر کچھ دے دو صاحب۔"

ضمیر کے چہرے پر وہی ازلی غربت گومگو کیفیت میں

پوری آب و تاب سے جگمگانے لگی تھی۔ مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔

"معاف کرو۔" حفیظ نے بچے کو کہا اور کاشف نے سگنل کی سرخ بتی کو ایک گالی دی۔

"بہت بھوکا لگتا ہے بے چارہ۔۔۔" اس نے بہت بے بسی سے کہا۔

"بس رہنے دو ان کے یہ ڈرامے۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے۔"

"اللہ کے نام پر کچھ کھانے کو دے دو۔" گداگر بچے نے سوال دہرایا۔

"یہ کھانا میں نے جمیلہ اور بچوں کے لیے پیک کروایا تھا۔"

وہ پتا نہیں باہر کھڑے بچے سے بولا تھا یا شاپر میں پیک کھانے سے 'میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

یکدم اس نے شاپر بچے کی طرف بڑھا دیا۔

"تم کھا لو 'مجھے تم بہت بھوکے لگ رہے ہو۔"

کاشف کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ شدید بھوک میں اس نے ہاتھ روکا تھا اس کھانے سے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ لذت شیئر کرنا چاہتا تھا مگر اس نے یہاں بھی جھکا دیا تھا۔

"اس کی آنکھیں دیکھی ہیں 'اس کی رگ رگ میں غربت بھری ہے 'بندے کی آنکھ سیراب ہونی چاہیے۔'

میرے اطراف لفظ گھومنے لگے تھے اور کبھی کسی لنچ ٹائم پر ضمیر کا سنایا ہوا شعر مجھ میں ہل چل مچا رہا تھا۔

میری آنکھیں غریب ہیں ورنہ
دنیا کچھ اتنی بھی امیر نہیں

اور واقعی آج وہ غریب دنیا سے امیر ہو گیا تھا۔

آج تک ہم نے جو کھایا تھا' وہ ضائع کیا تھا لیکن آج کا رزق شاید ہمارے کسی اعمال میں کوئی نیکی بن جائے کوئی پُر اثر نیکی جو سارے گناہوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

میں نے اپنے جسم کو کانپتے دیکھا تھا۔ میں شاید رو بھی رہا تھا اور ضمیر نے مجھے سمیٹ لیا تھا۔

"مجھے پتا ہے تم کتنے رقیق القلب ہو تم سے اس بچے کی حالت نہیں دیکھی گئی نا۔"

"ہاں۔۔۔" میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی اور میرا ریا اور منافقت سے بھرا دل مجھ پر ہنسنے لگا طنز سے حسرت سے۔

میں نے سر جھکا لیا اور یہ طے تھا' میں اب زندگی بھر ضمیر کے سامنے سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا مگر مجھے اس پر پچھتاوا نہیں تھا' ایک گمان تھا۔ کیا پتا اسی پشیمانی سے میرے گناہ مٹ جائیں۔

یہ پشیمانی 'کوئی نیکی بن جائے۔ کوئی پُر اثر نیکی جو میرے سارے گناہوں کو ڈھانپ لے اور میرا اللہ تو واقعی بے حد معاف کرنے والا 'نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

وہ جب چھوٹے تھے تو ان کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے ابا نے ان کی اس کمی کو کبھی ان کی ذات کی خامی نہیں بننے دیا۔ انہوں نے جی جان لگا کر انہیں پالا پوسا یہاں تک کہ ان کی نوکری لگنے پر ان کے ابا نے ان کے لیے ایک لڑکی پسند کر کے شادی کر دی۔ نئی آنے والی لڑکی نے ان کی زندگی کو بھرپور انداز میں خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ابا سے دور نہیں ہوئے تھے' بلکہ بہت محبتوں سے ان کے دل سے' زندگی سے بندھ گئے تھے' مگر کچھ عرصے سے ابا بیمار رہنے لگے تھے۔

ان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا' وہ صبح اور رات کو اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ابا سے ضرور ملتے تھے۔ اس دن چھٹی تھی' سو وہ ناشتہ کر کے ابا کے کمرے میں آئے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی ان کی سماعت سے ان کے بچوں کی آوازیں ٹکرائیں۔

"دادا ابو ہر وقت سوتے ہی رہتے ہیں۔"

"مما کہتی ہیں' بوڑھے لوگوں کو نیند بہت آتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اور مجھے لگتا ہے' دادا ابو بھی ایک دن نانو کی طرح سوتے ہی رہ جائیں گے۔"

"ویسے یہ سب بوڑھے لوگ اتنا سوتے کیوں ہیں؟"

"کوئی کام جو نہیں ہوتا انہیں۔" اس کے بیٹے نے ان کو ایک حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی تو وہ آنکھیں میچ کر اس خوف ناک خیال سے پیچھا چھڑانے لگے' ضبط جواب دے گیا تو انہوں نے لاشعوری طور پر دونوں بچوں کو پیٹ ڈالا۔ ان کے رونے ہنگامے کی آواز سے ان کی بیوی کمرے میں آئیں اور معاملہ سمجھ کر بچے کو باہر لے گئی تھیں۔

وہ ابا کا ہاتھ تھامے بلک بلک کے روتے رہے۔

"آپ کو کچھ نہیں ہو گا ابا! آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے' پلیز ابا!"

وہ روتے رہے اور ان کے ابا جاگنے کے باوجود ان کے آنسوؤں میں بھیگ کر آنکھیں بند کیے لیٹے رہے' جانتے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کا اپنا ضبط بھی ڈول جائے گا۔ کچھ باتوں کو وقت آہستہ آہستہ خود سمجھا تا رہتا ہے۔ کچھ واقعات کے لیے جگہ چھوڑتا جاتا ہے' جن سے واقعات اس جگہ کو بھرتے جاتے ہیں اور ایک دن ابا کے جانے سے وہ خالی چھوٹی جگہ بھر گئی وہ بچوں کی طرح ابا سے لپٹ کر خوب روئے۔ ان کی بیوی ان کی ڈھارس بندھا رہی تھیں' یہاں تک کہ بچوں نے ماں کو گھیر لیا۔

"پاپا کیوں رو رہے ہیں امی؟"

ماں نے بچوں کو دیکھا' پھر نرمی سے بولیں۔ "اس لیے کہ آج ان کے ابا جو مر گئے ہیں۔"

بیٹی نے کندھے پر جھول کر کہا۔ "جیسے آپ کے پاپا مر گئے تھے؟"

"ہاں۔۔۔" ان کی آنکھوں میں تین سال پرانے آنسو نئی یادیں بن کر پھر سے امنڈ آئے تھے' تب بیٹے نے پوچھا تھا۔

"یہ سب لوگ مر کیوں جاتے ہیں؟"

انہوں نے سنجیدگی سے دیکھا' پھر آہستگی سے

بولیں۔ "عمر ختم ہو جاتی ہے تو اللہ انہیں اپنے پاس بلا لیتا ہے۔"

بیٹے نے معصومیت سے پوچھا؟ "مما! دادا کی طرح کیا اللہ میاں' پاپا کو بھی ایک دن اپنے پاس۔۔۔"

"حسن!" انہوں نے حسن کے منہ پر ہاتھ رکھا' دونوں ڈر کر انہیں دیکھنے لگے۔

پھر یوں ہوا رفتہ رفتہ وقت گزرتا رہا۔ ہاشم کو ابا کے غم پر صبر آ گیا۔ زندگی پرانی ڈگر پر چلنے لگی' ہاشم کے دونوں بچے جوان ہو گئے۔

مریم' سدرہ کی شادی کے دو سال زندہ رہیں اور یوں ہاشم تنہا رہ گئے' مگر یہ تنہائی زیادہ دیر برقرار نہ رہی' کیونکہ حسن نے اپنا جیون ساتھی چن لیا تھا۔ ہاشم بہت خوش تھے' مگر ان کا زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ شطرنج کی بازی جمائے دوستوں سے گپیں لگانے میں گزر جاتا یا وہ یونہی پیدل تفریح کے لیے نکل جاتے' مگر اب ان کا پوتا حسین ہوتا وہ سیر کرتے باتیں کرتے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔

ہاشم ابا کی طرح حسین میں اپنا تجربہ انڈیلتے رہتے اور ہنستے کھیلتے اپنے گھر آ جاتے' مگر کل کی سیر کے بعد ان کی طبیعت کچھ بوجھل تھی' حسن نے انہیں ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ دوائیاں جاری تھیں' مگر ان کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی جا رہی تھی' وہ بستر پر آنکھیں موندے لیٹے تھے کہ حسن اور سدرہ کا بیٹا ان کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"تمہارے دادا میرے دادا کی طرح ہر وقت سوتے رہتے ہیں' تمہیں پتا ہے کیوں؟"

"کیوں؟" حسین نے معصومیت سے پوچھا تو وہ بولا۔

"ان کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام جو نہیں ہوتا' پھر انہوں نے سونا ہی ہے نا!"

"لیکن حسین! انہیں اتنی نیند کیسے آتی ہے؟ مجھ سے تو نہیں سویا جاتا۔"

"ہاں۔ میری مما بھی مجھے زبردستی ہی سلاتی ہیں۔" حسین نے بھی اس کی تائید کی اور حیران نگاہوں سے ہاشم کو دیکھنے لگا، سردی کی وجہ سے ان کی سانس کچھ ٹھیک نہیں آرہی تھی اور بچے اسی بات کو غور سے نوٹ کررہے تھے۔

"آصف! میرے دادا کہیں مرنے والے تو نہیں۔"

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ دیکھو ان سے تو سانس بھی نہیں لی جارہی۔"

"حسین! کیا بکواس کررہے ہو؟" یکدم دروازہ کھلا۔ حسن نے حسین کو ڈانٹ کر کمرے سے باہر نکالا اور ہاشم کا ہاتھ چومتے ہوئے بے قراری سے رونے لگے۔

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا پاپا! آپ زندہ رہو گے میرے لیے، پاپا! مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔"

انہیں لگا وہ پھر ابا کی چارپائی کے قریب ابا کے ہاتھ تھامے بلک رہے ہیں، مگر ابا کی جوان کہی ان میں آنسو کی طرح اٹکی تھی۔ وہ حسن کے دل میں چھپی نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے آہستگی سے آنکھیں کھولی تھیں۔

"اگر میں تمہیں آنسوؤں میں یاد آیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ ادھر دیکھو ان پیاری آنکھوں کو میں نے ہنسنا سکھایا ہے۔ انہیں رونے کا ذائقہ دوں یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"پاپا...!" حسن کے بہتے آنسو رک گئے تھے۔

"زندگی ایک تجربہ ہے جب انسان بہت سے عقدے حل کرلیتا ہے تو موت ایک آخری دریافت کی طرح اس کے سامنے آتی ہے، وہ اس دریافت کے بھلے راز دوسروں سے شیئر نہ کرے، لیکن پھر بھی میرا ماننا ہے، جب تک ایک دل میں بھی آپ زندہ ہیں، آپ پورے کبھی نہیں مرتے۔"

وہ لمحہ بھر کو رکے، پھر سے مدھم ہوکر بولے۔ "تم نے ایک بار کہا تھا کلو پیٹو مینیا... ایک بیماری ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ایک کیفیت ہے اور زندگی کو برسوں سے اس کیفیت میں جینے کی عادت ہے۔ ہماری زندگی کے سب سے بہترین لمحات ہماری خوشیاں، ہمارا خوبصورت ماضی، ہماری سانسیں اور وہ خوبصورت چہرے جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں، سب چرا چرا کر اپنے جھولے میں ڈالتی دیتی ہے، مگر ایک چیز ہے امید، بس کوشش کرنی چاہیے، کبھی امید اپنے اندر سے کسی کو چرانے مت دینا۔ یہی تو سکھاتی ہے زندگی کرنا، غم میں خوشی کرنا، ادھر دیکھو جب میں نہیں رہوں گا تو کیا واقعی تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا؟ ہوسکتا ہے بہت شدت سے کبھی یاد نہ آؤں، مگر تم جب حسین کے ساتھ کوئی لمحہ شیئر کروگے، کوئی محبت بھرا لمحہ تو تمہیں میں یاد آؤں گا، جب تم اس کی آنکھوں میں کوئی خواب سجاؤ گے تو تمہاری آنکھوں میں میرا عکس جھلملایا کرے گا اور زندگی، وقت دونوں چاہیں بھی تو مجھ سے میری زندگی کی یہ لذت نہیں چھین سکتے، کیونکہ جو کچھ میں نے کمایا ہے وہ کسی سے چھینا نہیں ہے۔ محبت دے کر آپ کمایا ہے اور محبت کبھی ضائع نہیں جاتی، نہ زندگی میں نہ زندگی کے بعد، کلو پیٹو مینیا ایک کیفیت ہے، جو ہمیں ہر وقت ہیجان میں رکھتی ہے، مگر دینے والے دل کبھی آزردہ نہیں ہوتے۔"

"پاپا...!" حسن ان کے سینے سے لگ کر گہری ٹھنڈی سانسیں لے کر خود کو سنبھالنے لگے کیونکہ وہ جان گئے تھے بھلے یہ وجود ان سے چھن جاتا تھا، مگر اس وجود کی محبت وہ ہمیشہ ساتھ دیتی تھی۔ یہ محبت جو برس برس سے آگے ورثہ کی طرح منتقل ہوتی تھی اور محبت کا یہ سرکل آخری سانس تک چلنا تھا اور یہی امید تھی زندگی جینے کی سب سے گہری، سادہ مگر طاقتور امید۔